ماهنامة (مجلہ)

حیاتِ نو

بلریاگنج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلّہ

حیاتِ نو

جلد ۵ ________ شمارہ ۵

مئی ۱۹۹۰ء

* مدیر مسئول ________ نور محمد فلاحی
* مدیر ________ محمد اسمٰعیل فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

سالانہ زرِ تعاون	۴۰ روپے
خصوصی تعاون	۱۰۰ روپے
غیر ممالک سے	۲۰ امریکی ڈالر
فی شمارہ	۴ روپے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ "حیاتِ نو" جامعۃ الفلاح، بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۱

افضل نعیمی پریس برائے جمال پریس دہلی ...... کاتب: خالد حسن رشید، عبدالرحیم اعظمی، ارشد عثمانی

نقوش حیات نو

★ — اداریہ

ہمارے یہ مدارس — محمد اسمٰعیل فلاحی ۳

★ — بحث ونظر

تدبر حدیث کیلئے اقتباسات کا انتخاب — مولانا امین احسن اصلاحی ۷

دینی درسگاہوں کے نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم پر ایک نظر — مولانا داؤد اکبر اصلاحی ۳۰

اسلامی شعور اور جدید محاصل — ڈاکٹر کوثر عبدالفتاح الاکبی ۴۰

ایک سوال — سعید اختر ۳۸

★ — تعلیم وتعلم

ملٹن اور فردوس گمشدہ — ممتاز اصلاحی ۲۲

★ — تعارف وتبصرہ — عبدالبر اثری فلاحی ۵۶

★ — غزلیں — شفیع اللہ خان [illegible]، قمر دسولپوری ۲۱،۵۵

★ — لیل ونہار

ولی اللہ سعیدی جامعہ سے سبکدوش — محمد اسمٰعیل فلاحی ۶۲

اداریہ — محمد اسمٰعیل فلاحی

ہمارے یہ مدارس

فرانسیسی الجزائر پر قابض ہوئے اور اپنی ساری صلاحیت اس بات پر صرف کر دی کہ وہاں کے مسلمانوں کو اسلامی روایات، اسلامی شعائر اور اسلامی تعلیمات سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یہ بھی کیا کہ الجزائر کے دار السلطنت کی ۱۵ ذہین و ہونہار مسلمان لڑکیوں کا انتخاب کر کے انھیں نرسری اسکول میں داخل کر دیا اور گھر کے ماحول سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھیں کسی سے ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ مسیحی اور فرانسیسی طرز پر ان کی تربیت کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔ یہ لڑکیاں مختلف تعلیمی مراحل سے گزر کر بی۔ اے پاس ہوئیں لیکن ۲۲ جون [illegible] کو فرانسیسی صحافت چیخ اٹھی جب یہ دیکھا گیا کہ یہ دختران ملت اسلامی لباس میں ملبوس اور پردے کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے امتحان ہال کی طرف بڑھ رہی ہیں حالانکہ ان کی نشو و نما پورے پندرہ سال فرانسیسی ماحول میں ہوئی تھی۔ فرانس کے وزیر اکٹ سے جب وجہ دریافت کی گئی کہ ایسا کیوں ہوا تو انھوں نے جواب دیا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں، قرآن اپنی تاثیر میں فرانس سے زیادہ طاقتور ہے۔" بالکل چھوٹی عمروں میں ان بچیوں کو قرآن پڑھا دیا گیا تھا اور اس کا نتیجہ نکلا کہ فرانس کی پوری جابر و قاہر مشینری اپنے تمام ہتھکنڈوں اور وسائل کے باوجود ان کا برین واش ([illegible]) کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔

یہ مسلّمہ ہے کہ فرانس کیا، دنیا کی کوئی طاقت بلکہ ساری طاقتیں بھی مل کر قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ قرآن اپنی تاثیر، سحر انگیزی اور اثر آفرینی میں کہیں بڑھ کر ہے۔ ہندستان کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے ہمارے یہ مدارس و مکاتب جہاں قرآن و حدیث

پڑھتے پڑھاتے جاتے ہیں، ان کی خدمات گرانقدر ناقابل فراموش اور تعارف کی محتاج نہیں ہیں، ملک کے بڑے بڑے مدارس ہی کی بات نہیں کرتا جن پر بلاشبہ اسلامیانِ ایشیا ہی کو نہیں، اسلامیانِ عالم کو بجا طور پر ناز ہے بلکہ قریہ قریہ، گلی گلی یہ بے شمار چھوٹے چھوٹے مکاتب اسلام، اسلامی اقدار، اسلامی روایات اور اسلامی تہذیب اور خود مسلمانوں کے پاسبان اور ان کا قلعہ ہیں۔ یہ ارتداد اور تجدد اور جارحیت کے آگے ایک مضبوط بند اور ناقابل تسخیر چٹان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو شاید ہندوستان اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اسپین بن چکا ہوتا۔

ان میں انبیاء کرام کے نائبین اور قرآن کریم کے حاملین جس طرح اپنے خون جگر سے اس گلشن کی آبیاری کر رہے ہیں اور سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے، یہ شمع کی طرح پگھلتے ہوئے دئیے کی طرح علم نبوت سے سرشار ہوتے اور پھر خود جل کر فیضان نبوت کی کرنیں بکھیرتے ہیں۔ ان کا امتیاز تصنیفِ کتب سے زیادہ تصنیفِ رجال ہے۔ وہ کاغذ کے اوراق کی شکل سے کہیں زیادہ چلتے پھرتے انسانوں کی شکل میں کتابیں ترتیب دیتے ہیں، یہ کسی گاؤں اور کسی قریہ میں جھیل بنے رہتے ہیں ایسی جھیل کہ جانے اس سے کتنے دریا نکلتے ہیں اور نگر نگر شہر شہر کشتِ انسانیت کو سیراب کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے تو بعض وہ ہیں جنھیں ان کی خدمات کا اعتراف ملا لیکن اکثریت ایسی ہے جو دنیا کی نظروں سے اوجھل بنیا دکی اینٹ کی سوت سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ لوگ ان جھیلوں سے نکلے دریاؤں سے تو خوب واقف ہوتے ہیں مگر بالعموم ان جھیلوں کا پتہ نہیں ہوتا، پھر بھی ان جھیلوں کو اس کا غم نہیں کہ وہ گوشۂ گمنامی میں ہیں نہیں اس کا دکھ نہیں کہ دنیا نے انھیں نہیں پہچانا اور نہ انھیں اس کی شکایت ہے کہ ان کی کوششوں کا صلہ انھیں نہیں ملا اور دنیا نے ان کی قدر نہیں کی۔ وہ ہر فکر اور ہر تحریک سے آزاد اور ستائش وصلہ اور شہرت سے بے پرواہ دریاؤں کو زیادہ سے زیادہ سیراب کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

ایک ایسی ہی شخصیت جو زندگی بھر شمع کی طرح پگھلتی رہی اور اسی طرح پگھلتے پگھلتے اپنے رب سے جا ملی، اس نے ملت کے مفاد پر اپنی شخصیت قربان کر دی تھی۔ اس کے انتقال پر زیک صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شہباز صاحب اصلاحی استاد دار العلوم ندوۃ العلماء کو یہ شعر لکھ بھیجا تھا:

تم تو ٹھہرے ہی رہے جھیل کے پانی کی طرح
دریا بنتے تو بہت دور نکل سکتے تھے

مولائے محترم نے جو جواب دیا اس کے بعض حصوں کا تذکرہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا مولانا نے جواباً لکھا تھا:

"..... شاعر کو جھیل کے پانی کا ٹھہراؤ ہی نظر آیا۔ ہر دریا کسی نہ کسی جھیل ہی سے نکلا ہے۔ گنگا کیا ہے، گنگوتری جھیل کا فیض، دور تک پہنچانے کا ایک واسطہ..... برہمپتر اور سندھ کس کو دور تک لے جاتی ہیں۔ مانسرور کے پانی ہی کو تو..... آہ دنیا میں گنگا، برہم پتر اور سندھ کی دھوم ہے لیکن گنگوتری اور مانسرور ہمالیہ کی بلندیوں میں روپوش رہا۔ دریا نہ بن سکنے کا کیا غم، جھیل بن کر دریاؤں کو مالا مال کیجیے....."

ملت کا فرض ہے کہ وہ ان مدارس کی حفاظت کرے، ان کے جال کو اور وسیع کرے کوئی ایسا گاؤں اور کوئی ایسی بستی نہ بچے جہاں ان کا وجود نہ ہو اور ملت کا یہ بھی فرض ہے کہ ان میں کام کرنے والے اور اپنی شخصیت کو قربان کر دینے والے ایثار پیشہ بوریہ نشینوں کی دیکھ ریکھ اور ان کی مکمل کفالت کرے اور کسی پہلو سے ان کی خودی کو ٹھیس نہ پہنچنے دے کہ انھیں کے دم سے ملت کا تشخص قائم، مسلمانوں کا وقار باقی اور اسلام زندہ ہے۔

یہ کتنے دکھ اور افسوس کا مقام ہے کہ انھیں گاؤں گاؤں اور شہر شہر پیسہ اور بھیک لے دوڑ کی ٹھوکریں کھانی پڑتی، لوگوں کی گھڑکیاں، اور جھڑکیاں سننی پڑتی اور چھپتے جملوں اور

نگیں اداؤں کے تیر سینوں پر لیتے پھرتے ہیں، حالانکہ ملت کا فرض تھا کہ انھیں اس کے لیے نکلنے نہ دیتی اور خود ان کی جگہ پہنچ کر ان مدارس کی ضروریات کی تکمیل کرتی، دربدر ہونے سے ان کا یہاں وہاں پھرنا اس دورِ ناقدری میں کوئی آسان اور معمولی بات نہیں ہے۔ خدا ان کے حوصلوں کو پست نہ ہونے دے اور ملت کو توفیق دے کہ وہ اپنے فرض کو پہچانے۔

آج ۱۹ شعبان المعظم ہے، مدارس دینیہ کا ایک اور تعلیمی سفر مکمل ہو رہا ہے۔ اس موقع پر ٹھہر کر، ان کے اساتذہ، طلبہ، کارکنان اور ان کی مجالس منتظمہ کو اپنا جائزہ لینا چاہیے، رسمی طور پر نہیں، بلکہ واقعی صحیح معنوں میں، اپنے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اپنا بے لاگ احتساب کرنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اپنے فرائض کو ادا کرنے میں ان سے کہاں کہاں کوتاہی ہوئی، کہیں ان کے عمل سے یا بے عملی سے مدارس کی حرمت کو بٹہ تو نہیں لگا اور کہیں ان کا تقدس پامال تو نہیں ہوا۔ فرض ناشناسی، انانیت و خودسری اور اغراض پرستی و مفاد پرستی نے کہیں دراڑیں تو نہیں ڈالیں۔ اساتذہ سوچیں انھیں ملت کے نونہالوں کی تعلیم و تربیت کرنی تھی، اس کا حق انھوں نے کہاں تک ادا کیا، طلبہ جائزہ لیں کہ وہ تعلیم و تربیت حاصل کرنے آئے تھے، کسی اور چیز میں تو نہیں پڑ گئے اور انتظامیہ کے افراد اور دیگر کارکنان دیکھیں

کہ مدارس کا نظم و انصرام، اسباب و وسائل کی فراہمی اور طلبہ و اساتذہ کی خدمت ان سے ہو رہی ہے یا کچھ اور۔ یہ خود احتسابی اور استغفار کا وقت ہے۔ اللہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگذر کرے اور ہمیں حسن عمل کی توفیق مزید سے نوازے۔

کاتب صاحب موجود نہیں، اسے کتابت کے لیے ان کے حوالہ کرنا ہے، اس کے بعد پریس کا مرحلہ ہے۔ دوسری طرف جامعہ بند ہو رہی ہے اور میں گھر جا رہا ہوں۔ نہیں معلوم کتابت اور پریس کے مراحل سے گذر کر یہ شمارہ کب ہمارے قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے؟

مولانا امین احسن اصلاحی

تدبر حدیث کے لیے امہات فن کا انتخاب

ملت اسلامیہ کا یہ بے مثل کارنامہ ہے کہ اس کے عظیم محدثین نے صدرِ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی اور صحیح علم کو ممکنہ حد تک غل و غش سے پاک کرکے قابل اعتماد ذخیرہ احادیث کی شکل میں مامون و محفوظ کیا —— احادیث کی جمع و تدوین کا یہ عظیم کام، ائمہ فن حدیث کے مقرر کردہ بے لاگ اصولوں کی روشنی میں دوسری صدی ہجری کے وسط سے لے کر تیسری صدی ہجری کے وسط کے درمیانی عرصہ میں انجام پایا۔ اس زمانہ کو 'عصر روایت' کے شباب کا دور کہا جاسکتا ہے۔ اس دور میں حدیث کا قابل قدر سرمایہ تحریری شکل میں مختلف مجموعوں کی شکل میں محفوظ ہو گیا اور یوں 'عصر روایت' کا اختتام ہو گیا۔ اپنی صفات و خصوصیات کی بنا پر ان مجموعوں کو قبولیت خواص و عوام اور شہرت و دوام حاصل ہوئی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علم نبی کی روایت کے دور میں وضع حدیث کا کاروبار بڑے وسیع پیمانہ پر ہوا ہے۔ اور جیسا کہ 'وضع حدیث کے محرکات' کے تحت ہم اچھی طرح جائزہ لے چکے ہیں کہ اس شنیع کام کے محرکات نیک اور بد، دونوں طرح کے رہے ہیں۔ اگرچہ یہ کام بہت بڑے پیمانہ پر اور نہایت منظم طریقہ سے ہوا، لیکن یہ بھی تاریخ کی ایک اہم حقیقت ہے کہ ہمارے ائمہ جرح و تعدیل نے ان واضعین کا تعاقب بھی بہت سرگرمی اور کامیابی سے کیا۔ ان نابکاروں نے موضوع روایات گھڑنے کو تو گھڑ لیں، لیکن ہمارے اکابر ائمہ کی مساعی کے طفیل وہ شامل

دی جا سکیں۔ انہی ارباب کی کوششوں کی برکت سے علم نبی بحیثیت دین شیاطین کی دراندازیوں سے بہت بڑی حد تک الحمد للہ محفوظ رہا ہے۔ اور اگر اس میں کچھ ملاوٹ ہوئی ہے تو وہ ایسی نہیں ہے کہ اگر آدمی بیدار نگاہ رکھتا ہو تو وہ اس کا امتیاز نہ کر سکے۔ بس بیداری شرط ہے۔ اور یہ شرط ہر علم و فن میں جس طرح ضروری ہے اس سے زیادہ حدیث میں ضروری ہے۔

ذخیرۂ احادیث تو بحرِ بے کراں ہے ظاہر ہے کہ اس قدر کثیر التعداد روایات جو مختلف ذرائع سے جمع کی گئی تھیں اور جن کی جمع و ترتیب مختلف ائمہ فن نے مختلف زمانوں میں کی ان کے متعلق یہ ناممکن ہے کہ ان کے سب مصادر ہر اعتبار سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوں اور وہ ایک ہی طبقہ اور مرتبہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اسلئے ہمارے محدثین نے کتب حدیث کو صحت، حسن اور ضعف کے لحاظ سے مختلف طبقات میں تقسیم کیا ہے۔ طبقۂ اول میں مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو شامل کیا گیا ہے۔ ان مجموعوں میں متواتر، صحیح اور حسن ہر قسم کی حدیثیں موجود ہیں۔ جہاں تک طبقۂ دوم کا تعلق ہے تو اس میں سنن اربعہ ـــــ یعنی ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ ـــــ شامل ہیں۔ ان مجموعوں میں اگرچہ تمام کی تمام حدیثیں تو طبقۂ اول کے درجہ کی نہیں ہیں تاہم ان کے مرتبین نے اپنے شرائط کے تحت تساہل سے بہر حال کام نہیں لیا ہے۔ طبقۂ اول کے برعکس ان میں باریک بینی اور ضبط کی کمی ہے۔ متاخرین نے ان کے جزوی ضعف کے باوصف انہیں قبول عام کی سند دے دی اور ان سے علم دین کے اخذ کا کام لیا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی احادیث نبوی دیگر کتابوں میں جستہ جستہ ملتی ہیں جو محدثین کے کڑے معیارِ تحقیق کی کسوٹی پر پوری اترتی ہیں، لیکن انکی حیثیت منتشر موتیوں کی ہے جن سے ماہرینِ فن ہی کما حقہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ہمارے محدثین ان صحاح ستہ اور مؤطا امام مالک کو حدیث کی اصلی اور بنیادی کتب قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب اپنی ایک الگ حیثیت کی مالک اور اپنی جداگانہ خصوصیات کی حامل ہے۔

تدبرِ حدیث کا فطری طریقہ

ـــــ حدیث سے صحیح معنوں میں فیضیاب ہونے کے لئے تدبر حدیث لازمی ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ حدیث پر غور و فکر کا فطری طریقہ کیا ہے۔ یہ بات بالکل غیر منطقی معلوم ہوتی ہے کہ آدمی جہاں سے چاہے اپنے غور و فکر اور تدبر کا آغاز کر دے۔ اس سے تمام سعی برباد جاتی ہے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ قرآن مجید کی مثال لیجئے۔ اس کی تفسیریں تو بے شمار ہیں، لیکن اصولی اور بنیادی اہمیت صرف تین تفسیروں کو حاصل ہے یعنی تفسیر ابن جریر، تفسیر کشاف اور تفسیر کبیر۔ باقی تفسیریں یا تو ان کے تتبع میں لکھی گئی ہیں یا ان سے خوشہ چینی کے نتیجہ میں ظہور میں آئی ہیں۔ چنانچہ ہمارے خیال میں تدبر حدیث کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس فن کی چند امہات کا انتخاب کر لیا جائے اور ان پر پورے استحضار کے ساتھ اس طرح غور کیا جائے کہ ان کی ہر بات اچھی طرح گرفت میں آ جائے اور اگر ان کی کچھ باتیں شک پیدا کرنے والی ہوں تو وہ بالکل متعین ہو کر سامنے آ جائیں۔ ان کی مشکلات حل کرنے کے لئے احادیث کے پورے قابل اعتماد ذخیرے میں سے، جہاں جہاں سے بھی کوئی رہنمائی ملنے کا مظنہ ہو مواد فراہم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس باب سے متعلق تمام منتشر مواد اکٹھا ہو جائے اور حدیث کی جو چیزیں حدیث کے فہم میں مددگار ہو سکتی ہیں ان کی تلاش و فراہمی میں حتی الامکان کوئی کسر نہ رہ جائے۔ اور یوں ایسی احادیث پر اس وقت تک غور و فکر جاری رکھا جائے جب تک نفیاً یا اثباتاً کوئی فیصلہ نہ ہو جائے۔ یہ چیزیں تحقیق میں معین بھی ہوں گی اور اس سے پورا ذخیرۂ احادیث نظر میں بھی رہے گا۔

حدیث کی امہاتِ کتب

ـــــ کسی فن کی امہات کے معنی یہ ہیں کہ اس فن میں جن کتابوں کو مرکزی اور اصولی حیثیت حاصل ہے۔ جو گویا اس فن کی تمام

کتابوں کی ماں ہیں کہ جن کے بغیر کام ہو نہیں سکتا۔ ان کا نظر انداز کرنا قطعی ناممکن ہوتا ہے۔ ان کا مقام یہ ہوتا ہے کہ ان کو منتخب کر لینے اور پوری طرح سمجھ لینے کے بعد یہ توقع کی جاتی ہے کہ کام کا صحیح راستہ مل گیا ہے۔ چنانچہ کسی فن کی امہات کو منتخب کرنا، ان کو پڑھنا، ان کا سمجھنا اور ان پر وقت صرف کرنا از بس ضروری ہے۔ انتخاب کا حق صرف انہی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جن کو اس فن میں دخل ہے اور جن کو اس کی مہارت ہے۔

اس مقصد کے لئے مرکزی حیثیت کن کتابوں کو دی جائے؟ اس سوال کے جواب میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ کسی کی رائے کچھ ہو سکتی ہے تو کسی کی کچھ۔ بہرحال عمر بھر کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ہماری رائے یہ ہے کہ حدیث کی امہات تین ہیں:

۱۔ موطا امام مالک
۲۔ صحیح امام بخاری اور
۳۔ صحیح امام مسلم

ہمارے نزدیک اگر کسی کی ان تینوں پر تدبر کی نظر ہے تو گویا اس کی حدیث کے اصل بنیادی ذخیرے پر نظر ہے۔ ان تینوں کا حقیقی مطالعہ حدیث کے طالب علم کو بہت بڑی حد تک اس فن کی اس قبیل کی دیگر چیزوں سے مستغنی کر دیتا ہے۔

ان چیزوں کو اس طرح پڑھئے کہ ان کی ہر چیز آپ کے سامنے آ جائے۔ آپ بخوبی یہ جان جائیں کہ ان کی کیا مشکلات ہیں، ان سے کیا سوالات پیدا ہوتے ہیں، کیا روایتیں ایسی ہیں کہ جو بالکل واضح طریقہ سے دل نشین ہو جاتی ہیں اور کیا روایتیں ایسی ہیں کہ جو دل میں کھٹک اور شبہ پیدا کرتی ہیں یعنی ان کے اندر گویا آپ کا نشان ہو گیا ہے۔ اس لئے ان پر غور کرنا اور رائے قائم کرنا ہے۔ اس طرح سے بعض جگہیں گویا ایسی متعین ہو جائیں گی کہ جہاں ڈیرہ ڈالنا پڑے گا۔ اور گہری کھدائی کرنا پڑے گی۔ اس مقصد کے لئے بڑی وسیع تحقیقات کی ضرورت پیش

آئے گی۔ اس وقت اس چیز کی تلاش کے لئے سارا ذخیرۂ احادیث آپ کی جولانگاہ بنے گا۔ مطالعۂ حدیث میں اصل مرکز نگاہ یہی چیزیں ہیں۔ مثلاً

فرض کر لیجئے کہ آپ کو اپنے مطالعہ کے دوران میں ایک روایت ملی اور اس میں بڑی کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ اب اس مضمون کی روایت کا جہاں جہاں مظنہ ہو کہ کہاں کہاں مل سکتی ہے اس کی تلاش کرنا پڑے گی۔ اور پھر یہ دیکھنا پڑے گا کہ وہ روایت کن کن طریقوں سے آئی ہے، کن راویوں سے آئی ہے، کن لفظوں میں آئی ہے، اس میں اور اس میں کیا کیا فرق ہے اور اس کے سمجھنے میں اس سے کس حد تک مدد مل سکتی ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتنی محدود چیز کو سامنے رکھ کر پورے ذخیرۂ احادیث پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنی پڑتی ہے اس طریقہ سے حدیث کی تمام کتابیں گرفت میں آ جاتی ہیں اور آپ بخوبی یہ جان جائیں گے کہ کس کتاب کی کیا قدر و قیمت ہے۔

ان تینوں امہات فن کے بارے میں ایک جامع وجہ ترجیح تو یہ ہے کہ امت نے ہر دور میں انکو حدیث کی دوسری کتابوں پر فی الجملہ ترجیح دی ہے۔ اور یہ ترجیح جو اعتراف عظمت اور شہرت کی شکل میں ملی ہے کوئی اتفاقی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ معقول اسباب ہیں جن میں سے بعض باتیں ہم بیان کرتے ہیں اس سے ان کی امتیازی شان واضح ہوگی۔

موطا امام مالک کی امتیازی خصوصیات

سب سے پہلے موطا امام مالک کو لیجئے۔ حدیث کی جمع و ترتیب کے سلسلے میں پہلی جو کامیاب کوشش ہوئی اور جسے شہرت دوام حاصل ہوئی وہ موطا امام مالک ہے۔ یہ امام ابو عبداللہ مالک بن انس بن عامر رحمۃ اللہ علیہ (۹۳ ہجری ـــ ۱۷۹ ہجری) کی تدوین ہے جو امام اہل مدینہ ہیں۔ انھوں نے ایک لاکھ احادیث سے صحیح حدیثیں منتخب کر کے اپنی موطا کو ترتیب دیا تھا جو کم و بیش ایک ہزار روایات پر مشتمل ہے۔

انھوں نے اس کتاب کی ترتیب میں چالیس سال کا طویل عرصہ صرف فرمایا وہ جب اس عظیم خدمت سے فارغ ہوئے تو انھوں نے مدینہ منورہ کے ستر جیّد فقہاء کو یہ کتاب دکھائی۔

امام شافعی علیہ الرحمۃ جیسے جلیل القدر امام حدیث و فقہ کا ارشاد ہے کہ آسمان کے نیچے کتاب اللہ کے بعد کوئی کتاب مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح نہیں ہے۔

امام مالک سے ایک ہزار سے زائد تلامذہ نے یہ کتاب روایت کی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے نسخوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس کے تمام نسخوں کی تعداد تیس ہے جن میں سے بیس زیادہ مشہور ہیں۔ یحییٰ بن یحییٰ لیثی اندلسی مصموری کی روایت سب سے زیادہ مشہور ہے۔

حدیث کے باب میں ان کے قائم کردہ اصول جن کا التزام انھوں نے برابر کیا ہے، ہمارے نزدیک نہایت قابلِ اعتماد ہیں جس سے ان کی کتاب کا رنگ بالکل مختلف ہو گیا ہے۔ ان کی احتیاطوں کی شان کتاب کے مطالعہ کے دوران محسوس ہوتی ہے۔

اس کتاب کی پہلی خصوصیت ہے کہ یہ مختصر اور جامع ہے۔ اس فن کی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں مختصر ہونے کے باوجود اس کی جامعیت کی شان پوری طرح قائم رہتی ہے اور تمام ضروری موضوعات کا پوری طرح احاطہ ہو جاتا ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ امام مالک روایت بالمعنیٰ کے معاملہ میں نہایت محتاط ہیں انھوں نے روایت بالمعنیٰ کے بارے میں ایک متوسط اور معتدل زاویہ نگاہ اختیار کیا ہے۔ وہ کم از کم قولِ رسول کی حد تک روایت روایت بالمعنیٰ کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ روایت باللفظ پر اصرار کرتے ہیں یعنی وہ مرفوع احادیث کی روایت بالمعنیٰ کو ناروا اور غیر مرفوع احادیث کی روایت بالمعنیٰ

کو روا قرار دیتے ہیں۔ مرفوع احادیث میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ 'با'، 'تا' اور 'یا' تک کا خیال رکھتے تھے۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ امام مالک اصحاب بدعت سے روایت لینے کے معاملے میں دوسرے ائمہ حدیث کے مقابل میں زیادہ محتاط بلکہ متشدد ہیں وہ اس طرح کی کوئی قید نہیں لگاتے کہ وہ اپنے عقیدہ و مسلک کا داعی ہو یا نہ ہو۔ وہ بطورِ اصول اہلِ بدعت سے روایت نہیں لیتے۔

اس کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ادبی معیار بہت ہی اونچا ہے۔ اس میں صدرِ اول کی خالص اور نہایت فصیح و بلیغ زبان پڑھنے کو ملتی ہے۔ جس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے حدیث کو سمجھنے کا ذوق پیدا ہوتا ہے۔

یہاں اس امر کا بیان بھی ضروری ہے کہ مؤطا میں جو در وازے سے آنے والی بعض روایتوں کی نوعیت بہر حال استثنائی ہے اس لیے کہ اس کتاب کی روایت، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، متعدد واسطوں سے ہے تو اس میں کسی ناقل سے جوڑ چیز کا گھسا دینا کوئی بعید بات نہیں ہے۔ بہر حال صاحب ذوق اسے بڑی آسانی سے نشان زد کر لیتا ہے۔ یہ کام چنداں مشکل نہیں ہے۔

مزید برآں یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کتاب کے لکھوانے میں بعض عباسی خلفا کی اس مبارک خواہش کا خاص دخل رہا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہو جو امت کے اندر فقہی اختلافات کی بڑھتی ہوئی رَو کو روکنے میں کارگر ثابت ہو۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری میں جب مسلمانوں کے فقہی اختلافات بہت بڑھ گئے تو اس صورتِ حال سے متاثر ہو کر وقت کے عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے جب کہ وہ ۱۴۸ھ میں حج کے لئے گیا امام مالک سے فرمائش کی کہ امت میں اختلافات فقہی بہت بڑھتے جا رہے ہیں اور

اور فساد برپا ہو رہا ہے اور اگر وہ اجازت دیں تو وہ تمام مسلمانوں کو امام موصوف کی فقہ پر مجتمع ہونے کے لئے تمام مملکت اسلامیہ میں حکم جاری کر دے لیکن امام مالک نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور فرمایا کہ ہر گروہ کے اسلاف اور ائمہ الگ الگ ہیں۔ اس لئے اگر امیر المومنین ان کو موجودہ حال ہی پر چھوڑ دیں تو بہتر ہے۔ ابوجعفر منصور امام مالک کے اس جواب کے بعد اس وقت تو خاموش ہو گیا لیکن اس خیال پر وہ برابر قائم رہا کہ امام مالک کے ہاتھوں اسلامی قانون مدوّن ہو جائے۔ چنانچہ ۱۶۳ھ میں جب وہ پھر حج کے لئے گیا تو اس نے اپنی سابق تجویز امام صاحب کے سامنے نہایت تفصیل اور پورے زور و قوت کے ساتھ رکھی اور تدوین قانون سے متعلق اس نے اپنا نقطہ نظر بھی ان الفاظ میں پیش کر دیا: "اے ابوعبداللہ (امام مالک کی کنیت ہے) آپ علم فقہ کو ہاتھ میں لیجئے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدوّن کر ڈالئے ــــ عبداللہ بن عمر کے تشددات، عبداللہ بن عباس کی رخصتوں اور عبداللہ بن مسعود کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدوّن کیجئے جو "خیر الامور اوسطہا" کے اصول پر مبنی ہو اور جو ائمہ اور صحابہ کے متفق علیہ مسائل کا مجموعہ ہو۔ اگر آپ نے یہ خدمت انجام دے دی تو ان شاء اللہ آپ کی فقہ پر ہم مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے۔ اور اسکو تمام مملکت کے اندر جاری کر کے اعلان کر دیں گے کہ کسی حال میں اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے"۔ کہا جاتا ہے کہ امام مالک نے اس کی اس خواہش کو مدنظر رکھ کر مؤطا مرتب کی، لیکن وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ مؤطا کو پوری مملکت کے لئے اسلامی قانون کی حیثیت دی جائے۔ تاریخوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہی خواہش اپنے زمانہ میں ایک دوسرے عباسی خلیفہ ہارون الرشید نے بھی امام صاحب کے سامنے پیش کی تھی، لیکن انھوں نے اس کی خواہش بھی مسترد کر دی۔

بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب حکومت کی خواہش سے

گریز کر گئے لیکن فی الحقیقت اس تحریک سے متاثر ہو کر انھوں نے مؤطا مرتب کر کے امت کی ایک عظیم خدمت انجام دے دی جس میں اصول کو پیش نظر رکھا کہ امت کے فقہی اختلافات کم ہوں اور بیشتر چیزیں اس کے لئے فی الجملہ جامع ہو۔

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ (۱۷۰۳ء ــــ ۱۷۶۳ء) نے اپنے زمانے میں حدیث کی جو خدمت کی اس میں مؤطا امام مالک کو بڑی اہمیت دی۔ اس کتاب کا غالباً اہم پہلو ہے جس کی بنا پر شاہ صاحب نے نہایت اہتمام سے اپنے وقت کی عالم اسلام کی سب سے بڑی دو زبانوں یعنی عربی اور فارسی میں الگ الگ شرح لکھی۔ شاہ صاحب کے افکار پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ فقہی اختلافات کے علمی نقصانات سے امت کو محفوظ کرنے کے لئے انھوں نے بڑا علمی جہاد کیا ہے۔ ان کا خاص مشن یہ تھا کہ امت کے اختلافات کو دور کرنے کے لئے فقہ اسلامی کو ایسے راستہ پر لایا جائے کہ اس کے اختلافات دور ہوں۔ یہ ایک خاص فکر تھا۔ جو ان کے سامنے تھا اور اس طرح انھوں نے امام مالک کی تحریک کو اپنے دور میں آگے بڑھایا۔ شاہ صاحب ہی سے متاثر ہو کر اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب "اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل" لکھی۔

صحیحین کا مرتبہ و مقام:- صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے متعلق یہ بات مشہور عوام و خواص ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جو چند ہزار حدیثیں لی گئی ہیں وہ لاکھوں حدیثوں کے انبار میں سے چھانٹ کر لی گئی ہیں۔ ذرا اندازہ کیجئے ان عظیم خادمان حدیث کی اس محنت شاقہ کا جو رطب و یابس روایات کے انبار میں سے ان چند ہزار جواہر ریزوں کو چھانٹنے میں ان کو برداشت کرنی پڑی ہوگی۔ ان کی اس جاں گداز محنت ہی کی بدولت آپ کو یہ روایات ان

کتابوں میں اس شکل میں ملتی ہیں کہ ثقہ کی ثقہ سے روایت کے زینہ سے چڑھتے ہوئے آپ بغیر کسی شائبۂ ارسال و انقطاع اور بدون کسی اندیشۂ تدلیس کے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ قدس تک پہنچ جاتے ہیں۔

بہرحال ان اماموں کی خدمت کی داد دیجئے۔ ان کی یہ خدمت اتنی بڑی ہے کہ ہم ان کے سامنے گردن نہیں اٹھا سکتے۔ ان کے معیار صحت کی بنیاد پر امت نے صحیحین کو یہ درجہ دیا ہے کہ ان کا مقام مصادر اول سے فن حدیث کی امہات کے طور پر رہا ہے اور یہ مقام موطا امام مالک کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ان کے بعد اگر کچھ اور لوگوں نے بھی کام کیا ہے تو انہی کی اتباع میں کیا ہے۔

یہاں اس امر کا بیان بھی ضروری ہے کہ امام بخاری اور امام مسلم نے ایسی تمام احادیث کا ذکر کرنے کا التزام نہیں کیا جن کو محدثین کی اصطلاح میں صحیح سمجھا جاتا ہے۔ معدودے چند احادیث ایسی ہیں جن کی صحت کا اعتراف کرنے کے باوجود امام بخاری اور امام مسلم نے انہیں اپنی کتابوں میں ذکر نہیں کیا وہ یا تو سنن اربعہ میں مذکور ہیں یا دیگر کتب حدیث میں جن کو صحیح تصور کیا جاتا ہے؟

امت کے ایک گروہ نے صحیح بخاری کو ترجیح دی ہے اور دوسرے نے صحیح مسلم کو۔ صحیح بخاری کو ترجیح دینے والے زیادہ ہیں لیکن مغاربہ نے صحیح مسلم کو ترجیح دی ہے۔ ہماری رائے میں ان دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے اور دونوں کی خوبیاں الگ الگ ہیں۔ یہ چنداں ضروری نہیں ہے کہ ایک کو دوسری پر لازماً ترجیح دی جائے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر ترجیح حاصل ہے جیسا کہ ہم آگے مفصل بیان کریں گے۔

صحیح امام بخاری کی امتیازی خصوصیات

صحیح امام بخاری ہے۔

حدیث کے جلیل القدر امام، ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہ

(۱۹۴ھ — ۲۵۶ھ) کا عظیم کارنامہ ہے۔ انھوں نے اسے تقریباً پانچ لاکھ حدیثوں کے انبار سے مدون کیا۔ انھوں نے اپنی کتاب کی ترتیب و تہذیب میں سولہ سال صرف کئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار سے زیادہ شیوخ حدیث سے استفادہ کیا۔ ستر ہزار طلبہ نے امام بخاری سے ان کی صحیح کا درس لیا۔

صحیح بخاری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا معیار اسناد موطا کے سوا سارے ذخیرۂ احادیث میں سب سے عالی ہے۔ سند کے معاملے میں امام بخاری کی احتیاط اپنے نقطۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ انھوں نے روایت حدیث میں دو شرطیں مقرر کی ہیں: ایک یہ کہ حدیث کا راوی اپنے شیخ کا معاصر ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کا سماع بھی ثابت ہو۔ اس کے برعکس امام مسلم صرف معاصرت کو لقاء کے لئے کافی سمجھتے ہیں اور سماع کو ضروری خیال نہیں فرماتے یعنی اگر ایک راوی دوسرے راوی کا معاصر ہے تو امام مسلم اس کی ملاقات بدون کسی اور دلیل کے مان لیں گے جب کہ امام بخاری اس وقت تک نہیں مانتے جب تک ایک کی ملاقات دوسرے سے ثابت نہ ہو۔ ان کو اس معاملے میں ایسا اصرار ہے کہ انھوں نے نہایت سخت الفاظ میں اپنی صحیح کے مقدمے میں امام بخاری کے اس موقف پر تنقید کی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری بحث پورے غور و فکر کے ساتھ پڑھنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ امام مسلم نے جس شدومد کے ساتھ لکھا ہے ان کی بات اتنی قوی نہیں ہے۔ امام بخاری کی بات زیادہ قوی، زیادہ محتاط اور زیادہ مدلل معلوم ہوتی ہے۔

ان کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے باوجود ایک ہزار سے زیادہ شیوخ حدیث سے اخذ و استفادہ کے صرف انہی محدثین کی روایتیں منتخب کیں جو ایمان کو قول و عمل کا مجموعہ قرار دیتے تھے۔ اسی وجہ سے کلامی اعتبار سے کتاب کی شان نہایت نمایاں ہے۔ اور اس کے بغور مطالعہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کتاب کی ترتیب کے وقت یہ پہلو بھی پوری طرح سے

اس کے پیش نظر رہا ہے کہ مرجئہ اور ان کے جتنے ہم مشرب گروہ ان کے زمانے میں تھے اور انھوں نے جو فتنے ان دنوں اٹھائے تھے ان کا قلع قمع کیا جائے یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ آج بھی کلامی اعتبار سے مرجئہ ہی کا مذہب اسلامی دنیا میں عملاً رائج ہے اور عمل کی وقعت بالکل ختم ہو گئی ہے۔ دین و شریعت کے چند ظواہر کی رسمی پاسداری نجات کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔ جب کہ اصل یہ ہے کہ ایمان بے معنی ہے اگر اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ وہ ایمان جس کے ساتھ عمل نہیں ہے اس کی دینِ اسلام میں کوئی وقعت اور قدر و قیمت نہیں۔ ایسا ایمان بالکل ٹھوٹھ درخت کے مانند ہے جس میں عمل کے برگ و بار پیدا ہی نہیں ہوتے۔ عمل ہی سے ایمان زندہ ہوتا، جڑ پکڑتا اور قوت پاتا ہے اور یہ عمل ہی ہے جو انسان کو عند اللہ مقبولیت، عظمت اور رفعت بخشتا ہے۔ اپنی کتاب میں امام بخاری نے دین کی اس حقیقت کو پوری طرح سے واضح فرمایا۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی صحیح کے عنوانات ایک خاص طریقے سے مرتب کئے ہیں جس سے ان کی وسعتِ علم اور تفقہ فی الدین کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی وجہ سے تربیتِ فکر کے پہلو سے اس کا درجہ بڑا اونچا ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ یہ دماغ کو جھنجھوڑتی اور غور کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس لئے تفہیمِ دین کے لئے یہ نہایت اہم ہے۔

صحیح امام مسلم کی امتیازی خصوصیت

صحیح امام مسلم حدیث کے عالی مقام امام، ابو الحسین مسلم بن حجاج بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ (۲۰۶ھ - ۲۶۱ھ) کی شاندار تالیف ہے۔ انھوں نے تین لاکھ احادیث سن کر ان میں سے اس کو مرتب فرمایا تھا۔ امام مسلم کو بجا طور پر اپنی کتاب پر بڑا ناز تھا کیونکہ اس کی ترتیب و تہذیب میں انھوں نے جس درجہ کاوش اور عرق ریزی سے کام لیا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر محدثین دو سو سال تک بھی حدیثیں لکھتے رہیں تو ان کا انحصار و مدار صحیح مسلم ہی پر ہوگا۔ اور میں نے کوئی حدیث اس کتاب میں بے سمجھے اور دلیل قائم کئے بغیر نہ داخل کی ہے اور نہ موجودہ ذخیرۂ حدیث سے اس کے بغیر نکالی ہے۔

صحیح مسلم کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ امام مسلم نے اس بات کا التزام کیا ہے کہ عموماً وہی حدیث نقل کرتے ہیں جس کو دو ثقہ تابعیوں نے دو صحابیوں سے روایت کیا ہو اور اسی طرح ہر طبقہ میں دو ثقہ یعنی معتبر شخص دو شخصوں سے روایت کرتے آئے ہوں جب کہ امام بخاری نے اس شرط کا خیال نہیں رکھا ہے۔

اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حدیث پر غور کرنے کے لئے اس کی ترتیب سب سے زیادہ سائنٹیفک ہے۔ انھوں نے احادیث کو ایک خاص طریقہ سے مرتب کیا ہے۔ انھوں نے ہر ایک حدیث کے لئے ایک خاص مقام، جو مناسب تھا مقرر کیا ہے اور وہیں اس روایت کے تمام طریقوں کو جمع کر دیا ہے اور نیز یہ کہ اس کے مختلف الفاظ کو ایک ہی مقام پر بیان کیا ہے تاکہ قاری کو آسانی ہو اور اس کے لئے تمام طرق سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو۔ اس کے برعکس امام بخاری کا طریقہ مختلف ہے۔ وہ کسی حدیث کے مختلف طرق کو متفرق و متباعد ابواب میں ذکر کرتے ہیں جس سے حدیث کے طالب علم کے لئے مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان روایات کے بارے میں جن کے متعلق آپ کو شکوک و شبہات ہوں گے صحیح مسلم سے جو مدد ملے گی وہ دوسری کتابوں سے نہیں ملے گی۔ اسی لئے یہ کتاب، فہمِ حدیث کے مقصد سے ممتاز ترین ہے۔

اس کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ امام مسلم رُواۃِ حدیث کے الفاظ ضبط کر دیتے ہیں۔ مثلاً یوں کہتے ہیں کہ حدثنا فلان و اللفظ لفلان، قال او قال حدثنا فلان۔ اسی طرح جب راویانِ حدیث کے درمیان تین

حدیث کے ایک حرف یا راوی کی کسی صفت یا نسبت یا کسی اور بات میں اختلاف ہو تو امام مسلم اس کو ذکر کر دیتے ہیں اگرچہ وہ حرف اتنا معمولی ہو کہ اس کی تبدیلی سے معنی میں کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ اس سے ان کی امانت و دیانت اور حفظ و ضبط کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ الفاظ سے ایک صاحب ذوق کو یہ اندازہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ اس حدیث کے راویوں میں سے کون راوی صدر اول کی زبان کو زیادہ محفوظ رکھنے والا ہے۔

امام مسلم کے متعلق یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ وہ اصحاب بدعت سے روایت لینے میں متہم ہیں اور الیسا کم تر درجہ میں امام بخاری کے متعلق بھی ہے۔ یہ علم بعض مشکل روایات کی توجیہ کے لئے مفید ہو سکتا ہے۔

خلاصۂ بحث

ان تینوں کتابوں میں، جو امہات فن کے درجے پر فائز ہیں، ہمارے خیال میں احادیث رسول کا اتنا ذخیرہ موجود ہے جو پورے نظام دین کو متشکل کر دینے کے لئے کافی ہے۔ تو ممکن ہے کہ ان سے باہر کی کسی حدیث سے آپ کو ان کی کسی حدیث کی توضیح و توجیہ میں کوئی مدد مل جائے، لیکن دین کی تشریح کے معاملے میں آپ ان سے باہر کی کسی چیز کے بہت بڑی حد تک محتاج نہیں رہیں گے۔ دین کے نظام کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید کے ساتھ مل کر یہ چیزیں ان شاءاللہ کافی ہوں گی۔ حدیث کی کوئی دوسری کتاب ان کی قائم مقام نہیں ہو سکتی۔

ان تینوں کتابوں پر اچھی طرح عبور حاصل کرنے کے بعد اس فن کی دوسری کتابوں کے غث و سمین سے عہدہ برآ ہونے میں آدمی کو کوئی زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔ ان تینوں امہات فن کے محقق کے لئے حدیث کی بقیہ کتابوں کا سرسری مطالعہ بھی مفید اور کافی ہوگا۔

تدبر حدیث کے خواہاں، حدیث کے طالب علم کو اپنی نگاہ کو اچھی طرح

بیدار رکھنا ہوگا۔ بیداری کی یہ شرط تدبر حدیث کے لئے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کسی بھی علم و فن کے لئے۔ ہمارے قابل فخر محدثین نے حدیث پر تحقیق اور علوم حدیث کی تدوین کا عظیم کارنامہ اپنی بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمال حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ انھیں کے قائم کردہ اصولوں اور مزید فطری اصولوں کی رہنمائی میں اسے اور ترقی دی جا سکتی ہے۔ بس آدمی کا فرض ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس مغالطہ میں مبتلا نہ ہو کہ تحقیق و تنقید کا کام ہمارے اسلاف کر گئے ہیں، اب ہمیں صرف حدیث کا دور کرنا ہے۔ بلکہ اس کا مشن یہ ہونا چاہئے کہ تحقیق حق کے لئے اسے بھی ان کی اس عظیم علمی تحریک کو آگے بڑھانا ہے۔

(ترتیب: ماجد خاور)

غزل

[illegible]

وقف خنجر ہے ابھی تک آدمی کا بانکپن
خون میں ڈوبا ہوا ہے زندگی کا بانکپن
ہم اگر مٹ جائیں گے، تم بھی فنا ہو جاؤ گے
ہم سے قائم ہے وقار زندگی کا بانکپن
سرزمیں سے ہے فلک تک تیرگی ہی تیرگی
نرغۂ ظلمات میں ہے روشنی کا بانکپن
ہوشمندوں کے دلوں پر بے خودی کا راج ہے
اوج پر ہے ان دنوں دیوانگی کا بانکپن
قوت باطل سے ٹکراتا رہا ہوں عمر بھر
یاد رکھو گے مری زندہ دلی کا بانکپن
انتہائے تنگ نظری الاماں والحفیظ
آدمی نے ڈس لیا ہے آدمی کا بانکپن
کیا خبر تھی دار جب فصل بہاراں آئے گی
خاک میں مل جائے گا اک اک کلی کا بانکپن

ملٹن اور فردوس گمشدہ

ممتاز اصلاحی

ملٹن انگریزی زبان کی شعری و ادبی تاریخ کا وہ تابناک ستارہ ہے جس کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑ سکتی اور جسے عام طور سے شیکسپیر کے بعد کا مقام حاصل ہے۔ وہ ایک وسیع المطالعہ شخص تھا جس نے زندگی کی سفاک حقیقتوں اور اپنے عصر کی تحریکوں کو بڑی خوش اسلوبی سے شاعری کے آئینے میں پیش کیا ہے۔

ملٹن دسمبر ۱۶۰۸ء میں شیکسپیر کی وفات سے آٹھ سال قبل لندن میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم سینٹ پالس اسکول میں ہوئی جو اس کے گھر سے قریب تھا۔ کیمبرج سے ۱۶۲۹ء میں بی۔ اے اور ۱۶۳۲ء میں ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ شعری سفر کا آغاز زمانہ طالب علمی ہی سے کیا اور انگریزی میں اور لاطینی نظمیں لکھیں۔ ابتدائی تخلیقات زیادہ تر لاطینی زبان میں ہیں۔

۱۶۳۲ء میں تعلیمی سلسلہ ختم کر کے باپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا جس نے اب لندن سے بیس میل دور (HORTON) نامی گاؤں میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ ملٹن کا باپ ایک شائستہ مزاج مذہبی انسان تھا جسے موسیقی پر خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ باپ کی تحریک پر اس نے لاطینی، یونانی، عبرانی اور فرنچ زبانوں، علم فلکیات و ریاضیات کا خصوصی دلچسپی سے مطالعہ کیا اور موسیقی سے اسے رغبت پیدا ہوئی۔ (HORTON) کے قیام کا مقصد خود ملٹن کے الفاظ کے مطابق اپنی تعلیم کی تکمیل تھا۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے زیادہ پرسکون دور تھا۔ اس دور کی تخلیقات میں

'ALLEGRO AND IL PENSEROSO'

اور ARCADES COMUS AND LYCIDAS جیسی لافانی نظمیں ملتی ہیں۔

مسلسل کئی برسوں کی خصوصی انہماک و مطالعہ کے بعد اس نے اٹلی کا سفر کیا۔ اٹلی کے سفر سے شروع ہونے والا زمانہ جو ۱۶۳۹ء سے ۱۶۶۰ء تک پھیلا ہے ملٹن کے لئے بڑی کشمکش اور آویزش کا ہے جس میں وہ بری طرح سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ یہی زمانہ انگلینڈ

میں مذہبی و اخلاقی تنگ نظری و سخت گیری کے عروج کا زمانہ ہے چنانچہ اس نے بہت سے اہم سیاسی و مذہبی مسائل پر مضامین لکھے اور ایک قابل ذکر نثری کارنامہ انجام دیا۔ اس عہد کی سب سے نمایاں چیز اس کی وہ تقریر ہے جو (AREOPAGITICA) کے عنوان سے پریس کی آزادی کے سلسلے میں اس نے کی۔ ہاں مگر اس دور میں اس کی شعری تخلیقات بہت محدود ہے اور کرامویل (CROMWELL) کی وفات ۱۶۵۸ء تک چند سانیٹ (SONNETS)[1] کے سوا اس نے دنیائے شاعری کو کچھ نہیں دیا جو براہ راست اس عہد کے کرب انگیز ہیجان کے غماز ہیں۔ ۱۶۴۳ء میں اس نے (MARY POWELL) میری پاول نامی ایک لڑکی سے شادی کر لی مگر یہ رشتہ اچھے نتائج کا ثابت نہیں ہوا۔

۱۶۴۹ء میں اسے کرامویل (CROMWELL) کا لاطینی سکریٹری بنا دیا گیا۔ اس منصب پر وہ فائز رہا اور اسی مصروفیت کے باعث اس کی بینائی جاتی رہی اور وہ مکمل اندھا ہو گیا۔ ۱۶۶۰ء کے بعد (۱۶۷۴ء) اپنی وفات تک وہ انتہائی پریشانی اور آشفتہ حالی کا شکار رہا۔ مگر شعری تخلیقات کے نقطۂ نظر سے یہ دور اس کی زندگی کا بے حد کامیاب اور درخشاں دور ہے۔ اسی عہد میں آ کر وہ یکسوئی کے ساتھ اپنی دیرینہ تمنا کی تکمیل یعنی ایک رزمیہ نظم کی تخلیق میں لگ گیا اور دنیائے شعر و ادب کو وہ لازوال تحفہ دیا جسے "فردوس گمشدہ" (PARADISE LOST) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ملٹن کا وہ مایۂ ناز شعری کارنامہ ہے جس میں اس کا اجتہادی رنگ اور انفرادی سوز و جوش حیات متحرک ہے۔ یہ وہی داعیہ ہے جسے اقبال نے عشق کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور جو اصل حیات بھی ہے اور جس سے موت کے شکنجے بھی ٹوٹتے ہیں۔ اس نظم کو (ILLIAD) اور (ODYSSEY) جیسی شاہکار کلاسیکل رزمیہ نظموں کے دائرے میں رکھا جاتا ہے۔ عظمت خیال اور شوکت اسلوب اس نظم کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

ملٹن نے گرچہ اپنے شعری سفر کا آغاز غزلیہ اور ڈرامائی نظموں سے کیا مگر یہ حقیقت ہمیشہ

---

[1] SONNET ایک مشہور صنف سخن

فرشتے، آدم و حوا، سانپ اور موت ہیں والٹیر (VOLTAIRE) کے خیال کے مطابق ملٹن نے اپنی بصیرت مندی اور ژرف نگاہی سے اس ڈرامے کی خامیوں سے گزر کر اس موضوع کی پوشیدہ عظمت کا ادراک کر لیا لیکن ڈاکٹر جانسن نے والٹیر کی مخالفت کی ہے اور اس کے پورے بیان کو وحشیانہ اور غیر مستند قرار دیا ہے۔

غالباً والٹیر کا یہ بیان اس بنا پر ہے کہ مذکورہ ڈرامے اور "فردوس گم شدہ" میں واقعات و تفصیلات میں حیرت انگیز حد تک مطابقت اور مماثلت ہے۔

(HAYLEY) ایک دوسرا انگریز مورخ اور نقاد کا کہنا ہے کہ ملٹن نے جس زمانے میں اٹلی کا سفر کیا اس وقت وہاں کئی ایسی نظمیں شائع ہو چکی تھیں جن کا موضوع فرشتوں کی جنگ، ہبوط آدم تھا، ایسی ہی نظموں میں سے ایک "Angeleida" تھی مورخین کا گمان غالب ہے کہ ملٹن نے دوسری بہشتی جنگ کا تصور اسی نظم سے لیا ہو

(HAYLEY) کا کہنا ہے کہ چونکہ اب ان نظموں کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں اس لئے کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی۔ اور دوسرے جدید نقاد مسٹر گوسس اور مسٹر ایڈمنڈسٹان (EDMUNDSTON) کے مطابق پیراڈائز لاسٹ کا ماخذ اور سرچشمہ اٹلی زبان کا کوئی ادب پارہ نہیں بلکہ ہالینڈ کے مشہور ترین ڈچ شاعر VONDEL کا ایک ڈرامہ ہے جس کا نام "LUCIFER" ہے اور جو ۱۶۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ مترجم روایت کے مطابق پیراڈائز لاسٹ سے چار سال قبل چونکہ "VONDEL" اس ڈرامے سے پیشتر اپنے کارناموں کے باعث مقبول ہو چکا تھا نیز انگلینڈ اور ہالینڈ کے مابین دوستی کا معاہدہ ۱۶۵۴ء تک مکمل ہو چکا تھا اس لئے عین ممکن ہے کہ یہ ڈرامہ انگلینڈ پہنچا ہو اور ملٹن کی نگاہ سے گزرا ہو۔

مسٹر گوسس نے بڑے وثوق سے لکھا ہے کہ "VONDEL" کے ڈرامے اور ملٹن کی نظم کی مطابقتیں محض اتفاق نہیں کہی جا سکتیں مگر ساتھ ہی یہ وضاحت بھی ضروری ہے

اس کے ذہن میں جاگزیں رہا کہ وہ ہومر اور ورجل کی رزمیہ نگاری کی روایت کو فروغ دے گا اور وطنی رزمیہ نگاری کی نمائندگی کرے گا۔ ابتدا میں اس کے ذہن میں ایک ایسی قومی رزمیہ نظم کا خاکہ تھا جو قبل تاریخ کے انگلینڈ کے رومانوی اور دیومالائی تصورات پر مبنی ہو چنانچہ اس سلسلے میں (APPOLOGY FOR SMECTYMNUS) میں لکھتا ہے میں نے شباب کی عمر پہ توجہ رکھا تو طبیعت اس طرف مائل ہوئی کہ اپنی رزمیہ نظم کی بنیاد اس اعلیٰ شاعری ادب کے سرمائے پر رکھوں جو ہمارے لائق اسلاف کا گراں قدر سرمایہ ہے۔

چنانچہ اسی وجہ سے کہ ملٹن کے ذہن نے رومانس کے میدان میں بھی چکر لگائے تھے اس کی نظم "فردوس گم شدہ" میں رومانوی احساسات کی پرچھائیاں رقص میں ہیں۔

اس کا ذہن اسپنسر کی تقلید کی طرف بھی مائل ہوا اور اس نے مذہبی حکمران آرتھر کو اپنی نظم کا ہیرو بنانا چاہا۔

غرض یہ کہ اس نظم کی تخلیق سے پہلے ملٹن کی ذہنی کیفیت اور طبعی میلان کو مختلف مراحل سے گزرنا پڑا کوئی رزمیہ نظم لکھنے کا خیال اس عہد کی تمام سیاسی ہنگامہ خیزیوں کے باوجود اس کے ذہن میں تازہ رہا اور آخر میں اس نے نظم لکھنے کیلئے PARADISE LOST کا عنوان منتخب کیا اور اس کے لئے تمام تیاری کی تھیم (THEME) تیار ہو جانے کے بعد مخطوطی شکل میں ترتیب دی گئی۔

اس نظم کی بابت بیشتر نقادوں کی رائے یہ ہے کہ اس کا مواد مستعار ہے لیکن ماخذ کے سلسلے میں خود نقادوں کے درمیان زبردست اختلاف رائے ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نقادوں کے مطابق والٹیر VOLTAIRE نے لکھا ہے PARADISE LOST کا مواد ADAMO نامی ایک ایسے ڈرامے سے ماخوذ ہے جسے اٹلی کے ایک ڈرامہ نگار نے لکھا ہے اور جسے نقد کے خیال کے مطابق ملٹن نے فلورنس میں دیکھا تھا اس ڈرامے کا موضوع زوال آدم (FALL OF ADAM) ہے اور اس کے کردار عام شیطان،

کہ "VONDEL" کا لیوسیفر نامی ڈرامہ موضوع کے محدود حصے یعنی شیطان کی بغاوت اور وفادار فرشتوں سے اس کی جنگ پر مشتمل ہے ملٹن کا مشہور مصرعہ

BETTERTOREIGNINHELL THAN SERVEINPARADISE

"VONDEL" کی دو لائنوں سے بے حد مشابہ ہے جس میں شیطان کہتا ہے کہ "خدا نے مجھے جنت سے نکال دیا تاکہ جو جنت میں اس کی فرمانبرداری نہ کر سکا جہنم میں فرماں روائی کروں۔"

بہرکیف یہ عین ممکن ہے کہ ملٹن جس نے ہومر اور ورجل سے بالقصد و برملا مواد مستعار لیا ہے، ونڈل اور آندرینی "ANDREINI" کی تخلیقات سے استفادہ کیا ہو لیکن ان قیاسات کا دلائل سے ثابت کرنا ایک مشکل کام ہے۔

انگریزی شعراء میں سے جن سے ملٹن کے استفادے کا خیال کیا جا سکتا ہے ترتیب زمانی اور اہمیت کے لحاظ سے "CAEDMON" کا نام ہے اس اینگلو سیکسن شاعر نے ساتویں صدی مسیحی میں ایک نظم لکھی تھی جس میں فرشتوں کا زوال، تخلیق کائنات اور آدم و حوا کا جنت سے اخراج موضوعات شامل تھے یہ نظم ۱۶۵۵ء میں ایمسٹرڈام "AMSTERDAM" میں شائع ہوئی تھی اور اس سے پہلے اپنی مسودہ شکل میں انگلینڈ کے اصحاب نظر کی نظر سے گذری ہوگی جب کہ ملٹن نے نارمن فتح تک کے عہد انگلینڈ کی تاریخ لکھی ہے اور یہ نظم اپنے موضوعی کردار کے نقطۂ نظر سے اس کی دلچسپی کا مرکز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے نقادوں کا یہ خیال ہے کہ یہ نظم ملٹن سے نظر انداز نہ ہوئی ہوگی۔

اس نظم اور ملٹن کی نظم میں حیرت انگیز مماثلت ہے کوئی شخص ملٹن کی یہ نظم اس طرح پڑھ کر نہیں رہ سکتا کہ اسے کیڈمن کی نظم یاد نہ آئے اگر اس نے وہ نظم پڑھی ہو۔ لیکن ایک چیز جو کیڈمن "CAEDMON" سے ملٹن کے استفادے کی قطعیت کی نفی کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی تمام نگارشات میں کہیں بھی کیڈمن کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

مگر حوالے سے اس احتراز کی چند وجہیں ہو سکتی ہیں

اس نے اپنے زمانے کے چلن کے مطابق ایسا کیا ہو یعنی لوگ اس عہد میں اپنے پیشروؤں سے استفادے کے اعتراف کے عادی نہ رہے ہوں یا ملٹن نے یہ سوچا ہو کہ اس نے کیڈمن سے اتنا کسب فیض نہیں کیا ہے جتنا عہد وسطیٰ کے لکھنے والوں سے جنھوں نے اپنی نگارشات میں آغاز کائنات کی داستان سنائی ہے یا ملٹن سرے سے کیڈمن نامی شخصیت سے واقف ہی نہ رہا ہو۔ بہرکیف یہ ایک ادبی مسئلہ ہے جس کا حل شاید ممکن نہیں۔

بعض نقادوں نے ملٹن کی تخلیق کا تعلق تیز فلیشر FINEASE.FLICHER کی لاطینی نظم (LOCUSTADE) سے جوڑا ہے جو ۱۶۲۷ء میں شائع ہوئی تھی اس نظم میں (LUCIFER) شیطان کی تقریر بعض ایسے خیالات رکھتی ہے جو ملٹن کے فرشتوں کی تقریر میں بھی وارد ہیں۔ ملٹن کی نظم کے دوسرے حصے کے ۹۲۳ ویں شعر میں زبان کے گرد فریب (LUCIFER) شیطان کی تقریر کے (IMITATION) نقل لگا کر ملتا ہے لیکن بجز و اتنی سی مطابقت اس ادبی روایت کے قبول کرنے کو کافی نہیں ہے کہ ملٹن نے نہایت دیانت داری سے یہ قبول کر لیا تھا کہ وہ اپنی اس لازوال تخلیق کے لئے فلیشر کی نظم (LOCUSTADE) کا مرہون منت ہے۔

انگریزی ادب کے ایک اور نقاد (DUNSTER) نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ملٹن اپنی نادر تخلیق کے لئے (SYLVESTER) نامی ایک شاعر کے ترجمے کا سب سے زیادہ مرہون منت ہے جو اس نے تخلیق کائنات کے موضوع پر فرنچ شاعر (DUBARTAS) کی نظم کا کیا تھا۔ اس نقاد کی دلیل یہ ہے کہ یہ ترجمہ ملٹن کے عہد کا اہم ترین اکتساب کیا تھا اور اسی گلی سے شائع ہوا تھا جس میں ملٹن کا باپ رہتا تھا چنانچہ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا فطری ہے کہ ملٹن اس ترجمے سے بچپن میں ہی روشناس ہوچ

جو اور ترجمے کے الفاظ و احساسات اس کے ذہن میں مرتسم ہو گئے ہوں اور انھیں نقوش کو بعد میں اس نے اپنی نظم میں اجاگر کیے ہوں۔

ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ (SYLVESTER) کے ترجمے نے اوّل اوّل ملٹن ہی کے ذہن کو اس مذہبی موضوع پہ لکھنے کی مہمیز کی ہو۔ بہرکیف یہ قیاس بھی حقیقت کی تجلّی سے خالی ہے۔

جہاں تک (DUNSTER) کے اس مفروضے کا تعلق ہے کہ اس مذہبی موضوع پہ لکھنے کی اولین تحریک (SYLVESTER) کے ترجمے سے ہوئی ہو سراسر بے بنیاد ہے کیونکہ مذہبی موضوعات پہ لکھنے کا رجحان ملٹن کے عہد اور اس کے معاشرے کی مذہبیت اور خود اس کی اپنی مذہبی وابستگی کا تقاضا کرتا تھا۔

اور جہاں تک واقعاتی، موضوعاتی اور اسلوبیاتی مطابقت و مماثلت کا تعلق ہے تو ملٹن کے عہد میں ایسی بہت سی ادبی و شعری کاوشیں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور فنکاروں کی ملتی ہیں جن کا موضوع مشترکہ شیطان کی بغاوت اور ہبوطِ آدم تھا۔ اسلئے ملٹن کی تخلیق کو کسی ایک خاص ادیب و شاعر کی تخلیق کا بلا دلیلِ قطعی محض قیاس کی بنیاد پر مرہونِ منت ٹھہرانا ادبی دیانت اور انصاف کے منافی ہے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ملٹن نے مذکورہ موضوع پر مختلف زبانوں کی تخلیقات کا مطالعہ کیا تھا اور حسبِ مطلب افکار و خیالات اخذ کیے تھے۔

یورپین رزمیہ نگاروں میں ہومر کے عہد سے یہ عام تھا کہ وہ مفید مطلب چیزیں لینے کو اپنا جائز حق سمجھتے تھے اور کسی قدیم فنکار کے احساسات و خیالات کو اپنے حق میں مفید مطلب بنانے کی اپنی ذہانت پہ ناز کرتے تھے چنانچہ ملٹن نے بھی اس چلن سے پورے دھڑلے سے ویسے ہی فائدہ اٹھایا جیسا کہ اس کے پیشرو ورجل نے۔ اور اسکے باوجود یہ دونوں عظیم شاعر اپنی تخلیقات کی جدت اور [illegible] originality کے دعوے سے دستبردار نہیں

ہیں ہوئے اس سلسلے میں دونوں نے شعوری طور پر اس روش کا جواز پیش کیا ہے۔

جب ہومر کی مسلسل نقل پہ ورجل کو لوگوں نے بہت زیادہ طعنے دیئے اور ملامت کی تو اُس نے جواب میں یہ سطریں لکھیں:

LET MY DETRACTORS try to steal for themseel ves, as they say I have stolen for myself, and they will find that it is easier to rob hercules of his club than to rob Homer of a single verse.

ملٹن نے بھی ایسی ملامت سے تنگ آکر اپنے دفاع میں یہی بات ان لفظوں میں کہی تھی

To borrow and better in the borrowing is no no plagiary,

ادب میں مواد مستعار لینا اور اسے نکھار کر پیش کرنا سرقہ نہیں ہے۔

ملٹن نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے۔

Industrious and select reading, was the chief mean by which he trained himself to be a great poet,

اور یہ تو ملٹن کیلئے ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے وسیع مطالعے کے عکس سے اپنی تخلیقات کو بچا لے۔

اب محض بعض چیزوں میں جزوی مناسبت و مماثلت کی بنیاد پر دعوے اور وثوق سے یہ کہنا کہ ملٹن (VONDEL) سے ماخوذ اور فلاں (SYLVESTER) کا مرہون منت ہے علم و تہذیب کے ترقی یافتہ اصولوں کے منافی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ جس ادیب یا شاعر کے بارے

بقیہ: ص ۳۹ پر

مولانا داؤد اکبر اصلاحیؒ

دینی درسگاہوں کے "نظام تعلیم" اور طریقہ تعلیم پر ایک نظر

علمی حلقوں کے لئے محترم مولانا داؤد اکبر صاحب اصلاحیؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ موصوف جہاں قرآنیات کے ایک زبردست عالم اور رمز شناس تھے۔ وہیں انھیں فن تعلیم اور اداروں کے نظم ونسق میں غیر معمولی درک حاصل تھا۔

مولانا مرحوم کا یہ بہت پہلے کا سپرد قلم کیا ہوا زیر نظر مضمون ان کے کاغذات میں دبا ہوا تھا یہ ہمیں ان کے لائق اور فاضل نواسے جناب مولانا محمد عارف عمری صاحب رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ کے تعاون سے حاصل ہو سکا ہے۔ جسے ہم موصوف کے شکریہ کے ساتھ نذر قارئین کر رہے ہیں۔

ادارہ

یوں تو جتنی دینی درسگاہیں ہیں سب ہی اپنے طور پر کام کر رہی ہیں بظاہر کسی کو بھی اپنے کاموں سے متعلق بے اطمینانی نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو اسلامی قلعہ کا نام دیا جا رہا ہے اور ان کے فضلاء وفارغین کو اسلام کا سپاہی سمجھا اور کہا جا رہا ہے، لیکن یہ باتیں بڑی حد تک بناوٹی اور حقیقت سے دور ہیں کیونکہ ان کا نظام تعلیم وقت کی ضروریات کا متحمل نہیں ہے اور نہ ان میں اسکی صلاحیت ہے کہ اس سے ایسے فضلاء تیار ہوں جو کامیاب طور سے یورپ کے پھیلائے ہوئے زہر کا تریاق بہم پہنچا سکیں اور قرآنی نظریات کی صحیح طور سے ترجمانی کر سکیں، ممکن ہے ارباب مدارس کو اپنے مدارس کے اسلامی قلعے ہونے پر اصرار ہو اور وہ اپنا خیال بدلنے پر راضی نہ ہوں اور ان سے اس باب میں سجدہ سہو کرنے پر اصرار بھی نہ کیا جانا

چاہئے، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان درسگاہوں کی حیثیت دنیا کی نگاہ میں یتیم خانوں کی سی ہو کے رہ گئی ہے؟ کیا اسے جھٹلایا جا سکتا ہے کہ ان مدارس کے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں رہ گیا ہے جس کے لئے وہ جدوجہد کرتے ہوں اور جو ان کا اوڑھنا بچھونا ہو؟ اور کیا اس کی تردید کی جا سکتی ہے کہ ان کے اکثر فضلاء جنھیں اسلام کا سپاہی کہا جاتا ہے بس غیر ضروری مسائل میں الجھنا ہی ان کا طرۂ امتیاز رہ گیا ہے؟ اور کیا یہ غلط ہے کہ ان کے مناظروں اور مناقشوں کے سبب فوجداریاں تک ہو جایا کرتی ہیں اور کیا اسے رد کیا جا سکتا ہے کہ ان کے اندر اخلاق وکیرکٹر کی جو بلندی ہونی چاہئے تھی وہ اس سے خالی ہیں۔ یہ ساری افسوسناک باتیں ان لوگوں میں پائی جا رہی ہیں جنھیں دوسروں کے لئے حسن عمل اور حسن کردار میں نمونہ ہونا چاہئے تھا اور جن کا وظیفہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا اور ایک کلمہ پر تمام مسلمانوں کو جمع کرنا تھا لیکن افسوس وہ اپنی یہ ذمہ داری بھول گئے اور خود باہم دست بگریباں ہیں، نوبت بایں جا رسید کہ یہ کسی مورچہ پر متفق ہو کر خدا کے باغیوں کے مقابل محاذ نہیں قائم کر سکتے۔ بالفرض تھوڑی دیر کے لئے اگر ایسا ہو بھی جائے تو مذہبی گروہ بندی کا زہر انکے ذہنوں میں اس طرح بس چکا ہے کہ پہلے ہی ہلے میں ان میں اختلاف پھوٹ پڑے گا۔ ممکن ہے اس کے اسباب و وجوہ کسی کے یہاں کچھ ہوں اور کسی کے یہاں کچھ، لیکن ہمارے نزدیک اس صورت حال کے پیدا کرنے میں مروجہ نظام تعلیم اور اس سے زیادہ طریقہ تعلیم کو بڑا دخل ہے،

صورت حال یہ ہے کہ دینی تعلیم کے ادارے الگ الگ جماعتوں کے نام سے چل رہے ہیں ہر ایک مخصوص قسم کے افکار کا علمبردار ہے اور سب میں جماعتی عصبیت بری طرح گھر کئے ہوئے ہے۔ کوئی شافعی مکتب فکر کا اسکول ہے تو وہاں فقہ حنفی کی خیر نہیں ہے اور اسی کے مقابل حنفی مکتب فکر کے اسکول میں فقہ شافعی کی بخیہ ادھیڑی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلباء کی ذہنیت مسموم ہو جاتی ہے اور وسعت و رواداری کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے سے محبت کے بجائے نفرت دلوں میں بیٹھ جاتی ہے اور حق وصواب کو اپنے ہی مسلک کے اندر محدود سمجھنے

کا روگ پیدا ہو جاتا ہے جس کے افسوسناک نتائج نگاہوں کے سامنے ہیں مدارس اسلامیہ کی موجودہ زبوں حالی دیکھ کر عقل چکرا جاتی ہے کہ الٰہ العالمین یہ کیا ہو رہا ہے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ دینی مراکز علم و عرفان کے گہوارے ہوتے اور ان سے فارغ ہونے والے حق و صداقت کے علمبردار بنتے اور شانہ سے شانہ ملا کر خدا کے آخری پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچاتے اور اخلاق و کردار کا ایسا نمونہ پیش کرتے کہ دنیا اسلامی اخلاق اور دینی رنگ میں رنگ جانے کو اپنے لئے سعادت تصور کرتی لیکن "چراغ تلے ہی اندھیرا" کے بمصداق خود ان مدارس کے اکثر فضلاء روح شریعت کے تقاضوں سے خالی ہو چکے ہیں اور ایسے مقام میں پہنچ گئے ہیں کہ ان پر تمسخر کیا جائے۔ یہ کونسی کمزوری ہے جس سے یہ محفوظ ہیں پھر بھی ارباب مدارس اسلامیہ کی گراں گوشی میں کچھ فرق نہیں آ رہا ہے حالانکہ مدارس فیل ہو چکے ہیں اور بغیر ان میں جان ڈالے کام کے آدمی اب ان سے نہیں پیدا ہو سکتے۔ آج ایسے علماء کے پیدا کرنے کی مطلق ضرورت نہیں جو فروعی مسائل کی مردہ ہڈیاں اکھیڑیں اور نہ ایسے لوگوں کی ضرورت جو دور از کار مباحث میں اپنی ذہنی و دماغی توانائی صرف کریں بلکہ ایسے فضلاء کی ضرورت ہے جو اس عقلیت کے دور میں اسلامی نظریات سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہوں کیونکہ یورپ نے اپنے باطل نظریات و افکار سے جس بری طرح ذہنوں کو متاثر کر دیا ہے اور خدا سے بغاوت پر جس قدر مٹیریل فراہم کر دیا ہے اس کا علاج اب یہ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ان سے اجتناب کی تلقین کی جائے بلکہ ضرورت ہے اس پر کاری ضرب لگانے کی، اور یہ اسی وقت ہو سکے گا جب اس کے نظریات سے بھرپور واقفیت پیدا کی جائے اس لئے ناگزیر ہے کہ نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم میں مکمل انقلاب پیدا کیا جائے دین و دنیا کے لئے الگ الگ تعلیم گاہیں نہ ہوں بلکہ دینی و دنیاوی علوم کے لئے مشترک درسگاہیں قائم کی جائیں اور بنیادی طور سے یہ تعلیم گاہیں اسلام کی خادم ہوں۔ نظام تعلیم از سر نو ایسا مرتب کیا جائے جس میں کتاب الٰہی (قرآن) کو مرکزی حیثیت حاصل ہو اور سارے

علوم اسی کے لئے پڑھے پڑھائے جائیں معاشیات، عمرانیات، اخلاقیات اور دیگر مغربی علوم پر اسی کی چھاپ ہو اور موجودہ طریقہ تعلیم جو مدارس میں چل رہا ہے اسے ایسے نہج میں بدل دینے کی ضرورت ہے جس سے جماعتی عصبیت اور حق و صواب کو ایک خاص حلقے ہی میں محدود سمجھنے کی ذہنیت کا خاتمہ ہو جائے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب تفسیر، حدیث اور فقہ جماعتی عصبیت سے بلند ہو کر پڑھی پڑھائی جائے اور حضرات ائمہ رحمہم اللہ کی تحقیقات پوری دیانت داری کے ساتھ عمدہ انداز میں ادب و احترام کے ساتھ پیش کی جائیں خواہ مخواہ کسی ایک مسلک پر زور نہ دیا جائے ورنہ اس کا حاصل بجز جھگڑالو مولوی کے اور کچھ بھی نہیں اور اس کی دنیا کو بالکل ضرورت نہیں ہے بنا بریں نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم میں تبدیلی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے

اوپر کے خاکے کے مطابق نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم میں تبدیلی عمل میں لائی جائے تو توقع ہے کہ ان مدارس سے ایسے سپاہی پیدا ہونے لگیں گے جو اسکے سچے خادم ثابت ہوں اور جو اسلامی تعلیمات کو دنیا کے سامنے نہایت خوش اسلوبی سے پیش کر سکیں گے اور دنیا مجبور ہوگی کہ ان کے پیش کئے ہوئے نظریات کے سامنے جھکے اور تسلیم کرے کہ واقعی سلامتی کی راہ یہی ہے جو اللہ کی یہ کتاب بتاتی ہے اور انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں میں کوئی ایسا نظام نہیں جو دکھی دنیا کے درد کا مداوا ہو سکے کیونکہ وہ سب کے سب خدا سے بغاوت پر مبنی ہیں، اس سے انکار نہیں کہ موجودہ حالات قرآنی تعلیمات اور قرآنی افکار کے لئے بالکل سازگار نہیں ہیں لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ یورپ جب اپنے باطل نظریات سے دنیا پر چھا سکتا ہے تو ان کے پاس تو نظام حق ہے جس میں خود غیر معمولی قوت تسخیر ہوتی ہے حق کی خاصیت مٹنا نہیں بلکہ بقا ہی خاصہ ہے وہ اس لئے نہیں ہے کہ شکست کھائے اور میدان دوسروں کے لئے چھوڑ دے۔ ضرورت ہے کہ دنیا کے سامنے اسلام کی ترجمانی صحیح طور سے کی جائے کیسا عجب ہے کہ وقت

کی طاقتوں میں سے کسی پر اس کی حقانیت آشکارا ہو جائے اور وہ اسے قبول کر لے اس طرح کی کایا پلٹ کا ہونا بعید نہیں ہے جبکہ حق کے تسخیر قلوب کی مثالوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے، آخری آسمانی کتاب اور اس سے پہلے کی دوسری آسمانی کتابوں کا جہاں جہاں نزول ہوا وہاں کے لوگ ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے کس درجہ گراوٹ میں تھے اور کیسے کیسے غلط معتقدات اور باطل خیالات کے شکار تھے اور پھر خدا کے داعیوں کی دعوت کی بدولت کس طرح ان میں سے بہتوں کی آن کی آن میں کایا پلٹ ہو گئی اور کیسے کیسے اخلاق و کردار کے پیکر سامنے آگئے اس کی ان گنت مثالیں تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس طرح کی کایا پلٹ آج نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ قبولیت حق کی صلاحیت کسی خاص دور اور کسی خاص خطہ ارض کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ بلا قید زمان و مکان اس کے لئے موقع اور موسم ہے آج بھی حق پذیری کی صلاحیت مفقود نہیں ہوئی ہے لیکن افسوس کہ اس انداز پر کام ہی نہیں ہو رہا ہے جو اس کے لئے موزوں ہے اور نہ قرآن کے چلتے پھرتے نمونے ہی پائے جا رہے ہیں، جو بھٹکتی دنیا کے لئے ہدایت کے چراغ کا کام کریں۔

مقام حیرت ہے کہ ایک اشتراکی اپنے اصولوں کی اشاعت و پرچار میں سرگرم ہے اور اس کی برتری تسلیم کرانے کے لئے در بدر پھر رہا ہے اور ایک جمہوریت پسند اپنے نظام جمہوریت کی مدح سرائی میں رات و دن ایک کئے ہوئے ہے اور اس کی انتھک کوشش ہے کہ دنیا سے اس کی افادیت کا لوہا منوا لے اور یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ دنیا کی آبادی کا بیشتر حصہ ان نظاموں کا قصیدہ خواں ہی نہیں بلکہ عملاً انہیں اپنے یہاں جاری کئے ہوئے ہے دوسری طرف اسلام کا نظام حق ہے جس سے نہ صرف دنیا سنورتی ہے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کے حسنات کا وہ ضامن ہے پھر بھی اس کا کوئی پرسان حال نہیں ہے لے دے کے دینی مدارس میں کچھ پڑھایا جاتا ہے اور غیر مرتب طور سے معلومات اس کے متعلق بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ رہی یہ بات کہ اسلامی نظام کیا ہے؟ اور اسے دوسرے نظام ہائے حیات پر کیا

فوقیت حاصل ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی جا رہی ہے بس دین کا تصور محدود طور سے چند امور کی انجام دہی اور دنیا کو دین سے یک قلم الگ کر دیا گیا ہے سمجھدار اور خوش حال طبقہ مسلمانوں کا اسلام کے باب میں اپنے اوپر کوئی ذمہ داری محسوس نہیں کرتا بلکہ اس کا سارا بوجھ مولویوں کے سر ڈال کر خود ہلکا پھلکا رہنا چاہتا ہے نہ اسکی زحمت گوارا کرتا ہے کہ خدا کی آخری کتاب کو اس اعتبار سے پڑھے کہ یہ کتاب ہم سے کیا مطالبہ کرتی ہے اور نہ اپنی اولاد کو اسکی تعلیم دلاتا ہے کہ وہ جانے اسلام کیا ہے؟ بلکہ اسکی تعلیم دلانے کو ملائیت اور دقیانوسیت تصور کرتا ہے حالانکہ یہ آخری کتاب نہ صرف مسلمانوں کے نام بلکہ جملہ باشندگان ارض کے نام بطور الٰہی پیغام آئی ہے عربی ہو کہ عجمی سب اس کے مخاطب ہیں جن لوگوں نے قرآن کے پیش کردہ حقائق کی تصدیق کی وہ مومن کہلائے اور جنھوں نے ان پر پردہ ڈالا وہ کافر کہلائے مومن مومن اس لئے ہے کہ وہ قرآن کی تعلیمات جو عین عقل و فطرت ہیں ان کا مصدق ہے اور کافر کافر اس لئے ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی صدا اور اپنی عقل کے فیصلے کی جو قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہیں تکذیب کرتا ہے کسی خاص قوم اور خاص مقام میں پیدائش ہونے کے سبب نہ کوئی مومن ہے اور نہ کوئی کافر ہے۔

خدا کی اور آسمانی کتابیں تو محفوظ نہیں رہیں لیکن اسکی آخری کتاب قرآن حرف بحرف محفوظ ہے اور یہ کسی قوم کی میراث نہیں ہے جس طرح سورج کی ضیا پاشی ہمہ گیر ہے اسی طرح اس کا نزول کسی خاص خطہ ارض کو اپنی تعلیمات سے مالا مال کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ پورے نوع انسانی کو فائدہ پہنچانے کے لئے اس کی آمد ہوئی جن لوگوں نے اس کتاب عظیم کا خیر مقدم کیا وہ مومن اور اس کے امین ٹھہرے صحابہ رضوان اللہ علیہم سب سے پہلے اس امانت کے امین ہوئے اور انہوں نے اپنی مقدس زندگیاں اسکی خدمت کے لئے وقف کر دیں اور حق امانت ادا کیا اس کے بعد تابعین و تبع تابعین کے سر یہ ذمہ داری آئی انہوں نے بھی اپنی وسعت بھر اس کا حق ادا کیا لیکن پھر اس میں خیانت ہونے لگی نوبت باینجا رسید

کہ آج ہر ملک میں جہاں وہ پائے جا رہے ہیں دو طبقوں یعنی خوش الحال طبقہ اور مفلوک الحال طبقہ میں بٹے ہوئے ہیں خوشحال طبقہ اپنے اور دین کی کوئی ذمہ داری نہیں سمجھ رہا ہے اسلامی ممالک میں باہم اقتدار کی لڑائی چل رہی ہے یہ اسکو نیچا کر دکھاتا ہے وہ اس کو یہی آئے دن ہو رہا ہے ہر جگہ کا غریب طبقہ اس صورت حال پر کڑھتا ہے لیکن کچھ کر نہیں پاتا اس لئے کہ خوش حال طبقہ کو بڑی طاقتوں کا سہارا بھی حاصل ہے۔

ہندوستان میں اس طرح کی تقسیم نہ تھی لیکن دوسرے ملکوں کی دیکھا دیکھی یہاں بھی خوشحال طبقہ دین سیکھنے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگا کسی دینی مدرسے میں تعلیم دلانے کو طالب علم کے مستقبل کو تاریک بنا دینے کا مرادف سمجھا جانے لگا دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، ندوۃ العلماء لکھنؤ ان کی نگاہوں میں دقیانوسیت اور تاریک خیالی کے اڈے ہیں ان میں ماضی کی طرف مڑنے کا مشورہ دیا جاتا ہے ان کا عدم و وجود تقریباً ان کے یہاں یکساں ہے اسی کے مقابلے میں وہ مرکز جہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور انسان کو ایک ترقی یافتہ جانور کی تصویر میں پیش کیا جاتا ہے وہ ان کے یہاں نہایت مہتم بالشان ہیں بھلے سے ان مراکز میں جا کر ان کا بچہ قرآنی تعلیمات کے مطالبات فراموش کر دے اور ہر امر میں اس کی ہدایت کی خلاف ورزی کرے ہی نہیں بلکہ علانیہ اسلام اور اسکی تعلیمات کا مضحکہ اڑائے تو بھی گوارا ہوتا ہے اس لئے کہ وہاں بچہ کا مستقبل روشن ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شاید اسلام کو اس سے کہیں زیادہ شکایت ہے جتنی ہندو یونیورسٹی سے ہے، ہندو یونیورسٹی میں اگر کوئی بات بالفرض اسلام کے خلاف کبھی بھی جاتی ہوگی تو وہ نا سمجھی سے لیکن یہاں تو اسلام اپنے دانشوروں کے ہاتھوں الٹی چھری سے ذبح ہو رہا ہے یہاں تو عبداللہ اور عبدالرحمٰن جیسے لوگ اسلام کو ایک خوبصورت پٹاری میں بند کئے ہوئے ہیں اور اجازت نہیں کہ اس کی کوئی بات بر سر عمل آئے بس دور سے گاہے گاہے اس کا درشن

کافی سمجھا جاتا ہے اس میں اسلامی کردار، اسلامی تہذیب اور اقلیتی کردار کے لیے حفاظت کی ضمانت ہے۔

فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا تھا کہ ایک خوب اونچا محل تعمیر کر دو میں اس پر چڑھ کر ذرا فضا میں ادھر ادھر جھانک کے دیکھوں موسیٰ جس اللہ کے ہونے کا مدعی ہے وہ کہاں ہے مجھے اس کی بات پر یقین نہیں آتا ہے۔

فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اب سے بہت پہلے تمسخر کیا تھا۔ قرآن کریم نے اس کے اس تمسخر کو قرآن میں محفوظ کر دیا فرعون موسیٰؑ کی دعوت حق کے باطل گروپ کا سربراہ تھا اس کا یہ مذاق ایک حد تک قابل برداشت تھا لیکن اسی طرح تشکیک کے بول اگر یونیورسٹیوں سے فرزندان اسلام کے منہ سے نکلنے لگیں تو وہ کیسے کریہہ اور خون کھولا دینے والے ہوں گے آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور ڈنکے کی چوٹ یہ سب کچھ کہا جا رہا ہے۔

اس صورت حال کا ماتم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ضرورت ہے کہ وہ کتاب اللہ کی جانب رجوع ہوں اور اس سے پوچھیں کہ اے کتاب الٰہی ہمیں بتا ہم کیا کریں؟ ایسا نہیں ہے کہ وہ خاموش رہے گی بلکہ ہر امر میں ان کی رہنمائی کرے گی اور بتائے گی جملہ مغربی علوم کو اسی کا خادم بنا کر ناقدانہ پڑھیں ہر رطب و یابس کو قبول نہ کریں اور یہ اسی وقت ہوگا جب کتاب اللہ کا علم حاصل ہوگا۔

مسلمانوں نے یونانی فلسفہ اور علم کلام اسلام ہی کی خدمت کے لئے سیکھا تھا اور آج بھی مدارس میں یہ علوم پڑھائے جاتے ہیں اب ضرورت ہے کہ اس کے بجائے وہ مغربی علوم اپنے یہاں جاری کریں اور نہایت خوش اسلوبی سے مغربی فلسفہ اور مغربی علم کلام کا جواب دیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جہاں مغربی علوم کا نظم رکھتی ہے وہیں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ قرآن مجید اور حدیث کی محققانہ تعلیم کا نظم کرے اور دوسرے اسلامی ادارے دینی علوم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کا بھی انتظام کریں اور جو شعبے بھی قائم کئے جائیں روح ہر ایک میں اسلام ہی کی ہونی چاہیے

(بقیہ صفحہ ۶۱ پر)

★ سعید اختر
مولوی گنج، لکھنؤ

ایک سوال

(بابری مسجد کے نزاع کے سلسلے میں)

آپ کہتے ہیں کہ ملک کے اہم مسائل میں بابری مسجد کا بھی ایک مسئلہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مسئلہ ہے کہاں؟ مسئلہ ختم ہو گیا۔ ہماری ایک عبادت گاہ تھی جس کا تحریری، تاریخی اور عدالتی ثبوت ہمارے پاس موجود ہے۔ آپ نے رات کی تاریکی میں اس کے اندر گھس کر اس کے ممبر پر مورتیاں رکھ دیں اور مسجد پر قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں کا وہاں داخلہ بلکہ اس کے قریب جانا تک ممنوع قرار دے دیا۔ لہٰذا اب مسئلہ کیا ہے؟ مسئلہ تو ختم ہو گیا۔

مسئلہ تو جب ہوتا کہ ہم وہاں اب بھی دن میں پانچ بار جا رہے ہوتے، ہر بار مورتیاں ہٹا کر نماز قائم کر رہے ہوتے اس لئے کہ سامنے اگر مورتیاں موجود ہوں تو نماز نہیں ہوتی، ہم اور بھی مختلف طریقوں سے اس پر ملکیت اور قبضہ کا مظاہرہ کرتے ہوتے اور آپ لوگوں کی بھی آمدورفت ہوتی، آپ بار بار مورتیاں رکھ کر پوجا پاٹھ کرتے اور قبضہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے۔ تب یہ ایک مسئلہ تھا کہ بھئی یا تو وہ جگہ ہندوؤں کو مل جائے اور مسلمان وہاں آنا جانا اور نماز ادا کرنا بند کر دیں یا مسلمانوں کے پاس ہی رہنے دی جائے اور ہندو بھائی اپنی مورتیاں ہٹا لیں ورنہ جھگڑے اور خون خرابہ کا اندیشہ ہے،

لیکن ایسا ہے نہیں، ہماری ایک چیز تھی جس پر آپ نے خفیہ طریقہ سے زبردستی قبضہ کر لیا ہے اور ہمارا ادھر سے گزرنا بھی ڈنڈے کے زور سے روک دیا ہے۔

اب صرف اتنا رہ گیا ہے کہ ہم مطالبہ کریں کہ ہماری مسجد ہمیں واپس کر دی جائے، آپسی گفتگو سے یا بذریعہ عدالت! اور آپ گولیوں کے ذریعے سے ہمارے مطالبات کا جواب دیں۔

کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان یہ کہہ دیں کہ ہم نے اپنی مسجد مندر بنانے کے لئے خوشی خوشی بلا جبر و اکراہ برادرانِ وطن کے حوالے کر دی یا ان لوگوں نے اس پر ناجائز قبضہ کر لیا اس پر ہم بہ درستگی ہوش و حواس راضی ہو گئے۔ غالباً آپ لوگوں نے اسی بات کی کوشش شروع کر دی ہے اس کام کے لئے پہلے آپ نے شری بوٹا سنگھ کو استعمال کیا، وہ ناکام ہو گئے تب مفتی سعید صاحب کو استعمال کیا گیا۔ وہ بھی زیادہ کامیاب نہ ہو سکے تو چین منی چاریہ سوشیل کمار کو آزمایا جاتا رہا اور اب بعض ایسے ہی عیسائی، مسلم اور ہندو بھائیوں کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ تاکہ ہم ایسے محضرنامہ پر دستخط کر دیں۔

آپ لوگوں کی خواہش بھی عجیب خواہش ہے۔ جسے آپ پورا کرنا چاہتے ہیں، دنیا میں کسی بھلے آدمی نے یہ نہیں کیا کہ مقتول سے تحریر لے لی ہو کہ ہم خوشی خوشی اپنی آزاد مرضی سے قتل ہونے جا رہے ہیں اور ہمارے ورثا عمر بھر قاتل کو دعائیں دیتے رہیں۔ پھر آپ ہی بولئے تاریخ میں ایسے "بھلے" کیوں بننا چاہتے ہیں۔ بس یہی میرا آپ لوگوں سے سوال ہے۔

مسئلہ کی نوعیت اگر اس سے کچھ بھی مختلف ہو تو ارشاد فرمایئے، ورنہ ساری دنیا کو بتا دیجئے کہ یہ ہے بابری مسجد کے مسئلہ کی نوعیت۔

بقیہ: ملٹن، اور فردوس گمشدہ

میں قیاس کیا جاتا ہے کہ ملٹن نے اس موضوع، مواد، پلاٹ، کردار یا اسلوب مستعار لیا ہے۔ اس لئے خود بھی مساوی درجے میں ملٹن کے ساتھ اپنے کسی پیشرو ادیب و شاعر کے سرچشمۂ تخلیق سے استفادہ کیا ہو جس سے دونوں ممکن ہوں، یا زیادہ ممکن شکل میں دونوں آغاز کائنات سے متعلق کسی روایتی داستان سے واقف ہوں جو قدیم دستکی کے پراسرار اخلاقی ڈراموں کے ذریعے نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی ہوئی ان تک پہنچی ہو۔

تحریر:- ڈاکٹر کوثر عبدالفتاح الابجی
کامرس ڈپارٹمنٹ، قاہرہ یونیورسٹی
ترجمانی:- عبدالحیٔ فاروقی فلاحی
شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اسلامی عشور اور جدید محاصل

اسلام کا مالیاتی نظام (FISCAL SYSTEM) دنیا کے تمام نظاموں سے ممتاز ایک مستقل مالیاتی نظام ہے۔ اس نظام کے قواعد و ضوابط کی بنیاد خود قرآن کریم نے ڈالی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی توضیح و تشریح فرمائی ہے اور عہد نبوی میں اسی پر عمل بھی ہوتا رہا ہے۔ آج حالات کے اندر نئی تبدیلیوں سے پیدا شدہ جزوی مسائل کو بھی انھیں بنیادی قواعد و ضوابط کی بنیاد پر قیاس کیا جائے گا۔ ؎

اسلام کے مالیاتی نظام میں آمدنی کے بہت سے ذرائع ہیں۔ زکوۃ کے علاوہ بھی ایسے بہت سے ذرائع ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ذرائع خلفاء راشدین اور سلف صالحین کے مقرر کردہ ہیں۔ انھوں نے شریعت کے قواعد کلیہ، زکوۃ کے احکام اور نبیؐ کے اقوال و افعال سے ان نئے ذرائع آمدنی کے احکام مستنبط کرنے میں اپنی زندگیاں کھپا دیں اور ایسے قواعد و ضوابط وضع کیے جو شریعت کے کسی بھی حکم سے نہیں ٹکراتے۔ اس طرح انھوں نے ہمارے لئے مطالعات اور تحقیقات کا ایک قیمتی علمی سرمایہ چھوڑا ہے جس کے اصول و ضوابط کو بنیاد بنا کر کوئی بھی مستحکم مالیاتی نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔

اس مقالے میں خلفائے راشدین کے زمانے میں قائم شدہ ایک نئے ذریعہ آمدنی "اسلامی عشور" سے بحث کی گئی ہے۔ لفظ عشر یا عشور کا استعمال عموماً فقہ کی زکوۃ یا مطلقاً محصول اور ٹیکس کے معنی میں ہوتا ہے لیکن یہاں اس سے مراد وہ ملی ٹیکس ہے

جو بیرونی تجارت کے اموال پر عائد کیا جاتا ہے۔

اس مقالے کا مقصد یہ ہے کہ جدید نظام محاصل کی روشنی میں اسلامی عشور کا مزاج واضح کیا جائے، اور بتایا جائے کہ اسلامی خطوط پر جدید مالیاتی نظام قائم کرنے میں عشور سے کس حد تک فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

یہ بحث تین اجزاء پر مشتمل ہے:

(۱) اسلامی عشور - ایک تعارف

عاصم بن سلیمان نے حسن کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ابو موسی اشعریؓ نے حضرت عمر بن الخطاب کو لکھا کہ ہمارے مسلم تاجر جب دارالحرب میں جاتے ہیں تو ان سے عشر وصول کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو لکھا کہ تم بھی ان سے ویسے ہی عشر وصول کرو جیسے وہ تمہارے تاجروں سے وصول کرتے ہیں۔ اور اہل ذمہ سے نصف عشر وصول کرو۔ اور مسلمانوں سے چالیس درہم میں ایک درہم۔ دو سو درہم سے کم میں کوئی عشر نہیں ہے۔ دو سو درہم ہو جائے تو اس میں پانچ درہم وصول کرو۔ پھر سو مزید ہو اس میں اسی حساب سے وصول کرتے جاؤ۔ ؎

اس طرح اسلام میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے عشور کا نظام رائج کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب مسلم تاجر دارالحرب میں جاتے تو ان سے عشر لیا جاتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اہل دارالحرب کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنے کا حکم دیا۔ ؎

عشور کا نظام اسلام سے قبل بھی موجود تھا۔ جرجی زیدان کا بیان ہے:

"اندلسی جبل طارق (جبرالٹر) کی آبی گزرگاہ سے آنے جانے والی کشتیوں کو روکتے تھے۔ جب انگریزی کشتیوں پر وہاں سے گزرتے تو "طریف" نامی ایک شہر میں ٹیکس ادا کرتے۔ لفظ Tariff جو درآمدات و برآمدات پر لگائے جانے والے ٹیکس کے لئے بولا جاتا ہے۔ لفظ "طریف" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جبکہ عربی کا لفظ "طریفۃ" بھی اسی معنی میں بولا جاتا ہے۔ اس طرح یہ ممکن ہے انگریزی کا لفظ Tariff "طریفۃ" سے منقول ہوا۔ "طریف" کی تحریف شدہ

شکل ہو سکے[٤٥]

اس طرح عربوں نے عشور کا طریقہ گذشتہ قوموں سے لیا۔ پھر اس کو اس طرح ترقی دی کہ حکومت کے عمومی ذرائع آمدنی میں شامل ہو گیا۔ چنانچہ اسلامی ادوار میں بھی عشور آبی گزرگاہوں سے گزرنے والی کشتیوں سے لیا جاتا تھا اور نقد یا جنس کسی بھی صورت میں وصول کیا جاتا تھا۔ یمن کے عمال یہ ٹیکس ہندوستان کی طرف سے آنے والی کشتیوں سے اپنے ساحل پر وصول کرتے تھے جنھیں مختلف قسم کی خوشبودار لکڑیاں، خشک، کافور، عنبر، صندل اور دار چینی وغیرہ ہوتا تھا۔ یہ چیزیں جنس کی صورت میں وصول کی جاتیں۔ کشتیوں سے حاصل ہونے والا یہ ٹیکس عباسی خلیفہ واثق باللہ کے زمانے میں ایک بہت بڑی رقم بنتا تھا۔

بیشتر جدید محققین کا خیال ہے کہ عشور سے وہی ٹیکس مراد ہے جسے آجکل (Customs duty) اور Tariff کے نام سے جانا جاتا ہے اسی پر قیاس کر کے بعض لوگ اسی قبیل کے دوسرے ٹیکسوں کے جواز کے بھی قائل ہیں[٤٦]

اس مقالے میں عشور کے غرض اور حقیقت سے بحث کی گئی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کی نوعیت اسی کسٹم ڈیوٹی کی تھی یا کسی اور چیز کی۔

عشور سے متعلق احادیث

ابو عبید کا بیان ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر نے رسول اللہ ؐ کو فرماتے سُنا کہ مکس وصول کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہو گا۔ پھر انھوں نے رویفع بن ثابت کے حوالے سے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ؐ کو فرماتے سُنا: مکس وصول کرنے والا جہنمی ہے (انھوں نے وضاحت فرمائی کہ صاحب مکس سے مراد عاشر ہے)۔[٤٧]

ابن عتیبہ کا بیان ہے کہ میں نے نبی ؐ کو فرماتے سُنا:

"جب تم کسی عاشر سے ملو تو اس کو قتل کر دو" اس سے ان کے نزدیک وہ شخص مراد تھا جو ناحق صدقہ وصول کرتا تھا۔ اور مکر بن المنبع کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے

کہ انھوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے پوچھا: کیا آپ کو معلوم ہے کہ حضرت عمر نے مسلمانوں سے صدقہ (عشور) لیا۔ انھوں نے جواب دیا "نہیں، مجھے نہیں معلوم"[٤٨]

ابن اثیر کا خیال ہے کہ مکس وہ ٹیکس ہے جو ماکس (عشار) وصول کرتے ہیں[٤٩]

مناوی صاحب مکس کے متعلق فرماتے ہیں اس سے مراد عشار ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو دوسروں سے ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ مناوی کے نزدیک یہ سب سے زیادہ مہلک چیز ہے اور ذہبی اس کو کبائر میں شمار کرتے ہیں"[٥٠]

"اس وقت یہ لوگ عشر کے نام پر ٹیکس وصول کرتے ہیں اور بھی دوسرے ٹیکس ہیں جن کا کوئی نام نہیں۔ یہ لوگ حرام مال کھانے اور اپنے پیٹ میں آگ بھرنے والے ہیں۔ ان پر اللہ کا غضب اور ان کے لئے سخت عذاب ہے"[٥١]

عشار کے متعلق بعض ائمہ کا شبہ ہے کہ ان میں سے کچھ تو رہزنوں سے مشابہ ہیں اور رہزنی چوری سے بھی زیادہ برا ہے۔ اگر عشار وصولی میں ظلم و تعدی سے کام لیں اور زبردستی وصول کریں تو اس کی شناعت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اسی طرح چونگیوں اور گوشہ نشینوں سے وصول کرنے والے بھی اتنے ہی گنہگار اور حرام مال کھانے والے ہیں۔[٥٢]

ابو عبید عشور کا مفہوم بیان کرتے ہوئے زیاد بن حدیر سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا: میں پہلا شخص ہوں جس نے اسلام میں عشر وصول کیا۔ میں نے پوچھا، آپ کن لوگوں سے عشر وصول کرتے تھے؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ ہم کسی مسلم یا معاہد سے عشر نہیں وصول کرتے تھے بلکہ صرف نصاریٰ بنی تغلب سے وصول کرتے تھے"۔ اسی مفہوم کی روایت عبدالرحمٰن بن معقل سے بھی مروی ہے[٥٣]

ابو عبید نے حرب بن عبید اللہ ثقفی عن جدہ روایت کی ہے کہ نبی ؐ نے فرمایا: مسلمانوں پر عشور نہیں ہیں۔ عشور صرف یہود و نصاریٰ پر ہیں"[٥٤]

سعید بن زید سے روایت ہے کہ نبی ؐ نے فرمایا: اے اہل عرب! اللہ کا شکر ادا

کرو کہ اس نے تمہارے اوپر سے عشور ہٹا دیئے ہیں۔[12]

مذکورہ بالا احادیث کی تشریح یوں کی گئی ہے کہ عشور صرف یہود اور نصاریٰ پر فرض ہیں۔ اگر صلح کے وقت ان سے عشر پر معاہدہ ہو جائے یعنی یہ کہ وہ ہمارے ملک میں سامان لائیں گے اور عشر ادا کریں گے تو ان پر عشر لازم ہوگا۔ مسلمانوں پر سوائے عشور زکوٰۃ (تجارتی سامان کی زکوٰۃ) کے اور کوئی علیحدہ عشر نہیں ہے اور اسی لئے مسلمانوں سے ٹیکس وصول کرنا حرام ہے۔[13]

مندرجہ بالا تشریحات سے واضح ہو جاتا ہے کہ عشور قابل مذمت ہیں۔ مسلمانوں سے اس کی وصولی بالکل حرام ہے۔ یہ صرف اہل حرب اور اہل ذمہ پر فرض ہیں۔ ابو عبید لکھتے ہیں: "اگر کوئی زکوٰۃ کی مقررہ شرح سے زائد کچھ بھی وصول کیا تو یہ غلط ہے۔"[14] اس سلسلے میں حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کرتے اور اہل حرب سے مکمل عشر کیونکہ مسلمان تاجر جب ان کے ملک جاتے تو وہ بھی ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے۔[15]

فرضیت عشور اور محدثین کی آراء

لیکن مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے عشور فرض کئے ہیں اور خاص اس کے متعلق احکام صادر فرمائے ہیں جس سے مالیاتی نظام اور ٹیکس کے موضوع پر تحقیق کرنے والے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ عشور آجکل کے TAX کے مفہوم میں ہیں اور اس سے مراد موجودہ Custum duty ہے۔ اسی لئے ان کا خیال ہے کہ عشور آج بھی مشروع ہیں اور موجودہ معاشرے میں بھی یہ واجب ہیں۔[16] (البتہ مذکورہ بالا احادیث میں عشور اور مکس کی جو مذمت آئی ہے اس کی تاویل کی گئی ہے۔)

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کے نزدیک بھی یہ موجودہ زمانے کے ٹیکس کے مفہوم میں ہے۔ چنانچہ اسلامی حکومت میں اس کی اہمیت اور نفاذ سے متعلق آپ کے

دلائل کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

۱۔ **قرآن سے استدلال** | وہ قرآن کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جنہیں فرمایا گیا ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی لوگوں کے حقوق ہیں:

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ والیوم الآخر والملئکۃ والکتاب والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمسٰکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوۃ واتی الزکوۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا (البقرہ: ۱۷۷)

(نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخرت اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مان لے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے۔ نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں۔ الخ ......)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت الگ چیز ہے اور مذکورہ بالا لوگوں پر مال خرچ کرنا الگ۔ اور دونوں بیک وقت ضروری ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بوقت ضرورت ان غرباء کی امداد کے لئے رقم نہ وصول کی جا سکے۔[17] اسی طرح انھوں نے ان احادیث سے بھی استدلال کیا ہے جن میں فرمایا گیا کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی دیگر حقوق ہیں۔[18]

۲۔ **شخصی ملکیت کا اقرار، مال میں دیگر حقوق کے منافی نہیں** | گرچہ اسلام شخصی ملکیت کا قائل ہے لیکن اس سے افراد کے مال میں حکومت کے حق کی نفی نہیں ہوتی ہے۔ اگر اسلامی حکومت میں ضرورتمند افراد اتنے ہوں کہ زکوٰۃ کی رقم ان کے لئے کافی نہ ہو رہی ہو یا اجتماعی مصلحت کا تقاضا ہو کہ ملک کو ترقی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط کیا جائے تو اس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے مال وصول کیا جائیگا یا دعوت

اور تبلیغ اسلام کی خاطر مال کی ضرورت محسوس ہو تو اسلام اس کے لئے امیروں سے پیسہ لینے کا قائل ہے کیونکہ یہ سارے کام اسلامی حکومت کے سربراہ کو انجام دینے ہیں اور بغیر مال کے ان کی انجام دہی ممکن نہیں اور بغیر ٹیکس کے مال حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ایک واجب کی ادائیگی کے لئے ٹیکس عائد کرنا بھی واجب ہے[۲۱]۔

۳- مکس ممنوع، مشروع ٹیکس سے مختلف چیز ہے | ڈاکٹر قرضاوی کا خیال ہے کہ مکس اور عشور کی مذمت میں آنے والی بیشتر احادیث صحیح نہیں ہیں۔ اور جو صحیح ہیں ان میں مطلق ٹیکس کی ممانعت نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قابل مذمت ٹیکس وہ ہے جس میں عمال ظلم و تعدی کرتے ہیں اور مالداروں سے ناحق وصول کرتے ہیں۔ یا وصول کردہ مال میں خیانت کرتے ہیں حالانکہ وہ اصلاً فقراء و مساکین کا حق ہے۔ اس پر وہ لفظ "عاشر" کی اس تفسیر سے استدلال کرتے ہیں جو بیہقی نے کی ہے[۲۲]۔ انھوں نے لکھا ہے: "عاشر وہ ہے جو ناحق صدقہ وصول کرتا ہے۔"

ڈاکٹر قرضاوی کا خیال ہے کہ مکس وہ ظالمانہ ٹیکس تھا جو اسلام سے قبل دنیا میں رائج تھا۔ جو ناحق وصول کیا جاتا تھا، غیر مناسب جگہ خرچ کیا جاتا اور عدل و انصاف کے ساتھ اس کی تقسیم نہیں ہوتی تھی۔ رہے وہ ٹیکس جو ملکی ضروریات پوری کرتے ہوں اور مصالح عامہ کی خاطر ناگزیر ہوں وہ نہ صرف جائز ہیں بلکہ اسلامی حکومت پر حسب مصلحت اور بقدر ضرورت ان کا عائد کرنا واجب ہے[۲۳]۔

خلاصہ کلام یہ کہ عشور کی حیثیت Customs duty کی ہے اور یہ ایک پیمانہ ہے جس کو اسی قبیل کے دوسرے ٹیکس عائد کرتے وقت ملحوظ رکھا جائیگا۔

ڈاکٹر قرضاوی کے دلائل کا جائزہ

ڈاکٹر قرضاوی نے اس بحث سے جو نتیجہ نکالا ہے اور دیگر محققین نے بھی ان کی تائید کی ہے ہم اس مقالے میں اس کا جائزہ لیں گے کیونکہ اس کے اثرات اسلامی معاشرہ کے اقتصادی مالی اور اجتماعی پہلوؤں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

(۱) کتاب و سنت سے استدلال | ڈاکٹر قرضاوی نے وہ آیات پیش کی ہیں جنہیں زکوٰۃ کے علاوہ بھی انفاق پر تحریض ہے۔ اس طرح انھوں نے جو کچھ فرمایا وہ علی الاطلاق تو صحیح ہے لیکن اس سے یہ استدلال کرنا محل نظر ہے کہ ذوی القربیٰ یتامیٰ، مساکین، ابن السبیل اور غلاموں وغیرہ جیسے ضرورت مندوں کی ضروریات عشور سے پوری کی جائیں گی کیونکہ آیت میں جس حق کا ذکر ہے اس کا عشور، مکس یا ٹیکس وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قرآن کریم اور سنت نبوی نے زکوٰۃ کے احکام، مقدار، اور اس کے مصارف ٹھیک ٹھیک متعین فرما دیئے ہیں۔ رہے ان میں دوسرے حقوق تو اس کا کوئی متعین ضابطہ نہیں ہے جس کی پابندی ضروری ہو۔ اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ یہ آیت پیش کی جا سکتی ہے۔ وَيَسْـَٔلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں پر عشور کی فرضیت اور مال میں زکوٰۃ کے علاوہ دیگر حقوق کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کے علاوہ دیگر حقوق تسلیم کرنے کو مشروعیت عشور کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔

(۲) شخصی ملکیت کا احترام | ملکی ضروریات کے ضمن میں جنگی، معاشی اور سیاسی مصالح کی تجہیزات سے متعلق مالداروں کی جس ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بلاشبہ حق ہے لیکن یہ بات محل نظر ہے کہ اس کو ٹیکسوں کے ساتھ بالعموم اور عشور کے ساتھ بالخصوص جوڑ دیا جائے۔

ٹیکس نافذ کرتے وقت حسب ذیل باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

(۱) سب سے پہلے زکوٰۃ نافذ کرنا ضروری ہے اور اس کی وصولی نیز مقررہ مصارف میں اس کو خرچ کرنے کا انتظام کرنا ضروری ہے۔

(۲) اگر زکوٰۃ کافی نہ ہو اور دوسری ایسی ضروریات ہوں جو زکوٰۃ کے مصارف کے ضمن میں نہ آتی ہوں تو ٹیکس عائد کیے جائیں گے اور اسلامی قوانین و ضوابط، عدل و استطاعت کی روشنی میں وصول کئے جائیں گے۔

جہاں تک عشور کا تعلق ہے تو یہاں معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ملکی ضروریات کی خاطر مالداروں پر ٹیکس کے جواز کا مطلب یہ نہیں کہ درآمدات و برآمدات کا کاروبار کرنے والے مسلم تاجروں پر ٹیکس عائد کر دیا جائے بلکہ ٹیکس صرف ان پر عائد کیا جائے گا جو اس کی ادائیگی کی قدرت رکھتے ہوں۔ اس طرح ٹیکس کے تقاضا میں چند باتوں کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

(۱) ٹیکس کے نفاذ کا تعلق افراد سے ہے نہ کہ مال (کی نوعیت) اندرونی یا بیرونی تجارت سے۔ کیونکہ ٹیکس صرف خوشحال و صاحب ثروت پر ہی لاگو کیا جا سکتا ہے۔

(۲) ٹیکس اتنا ہی عائد کیا جائے گا جتنے کی ملک کو ضرورت ہو اور ہر مالدار سے اس کی حیثیت کے مطابق وصول کیا جائے گا۔

(۳) اس طرح یہ ٹیکس بعض تاجروں پر لگ سکتا ہے اور بعض پر نہیں، قطع نظر اس سے کہ وہ اندرونی تجارت کرتے ہوں یا بیرونی۔

۳- مکس ممنوع، مشروع ٹیکس سے مختلف چیز ہے | ڈاکٹر قرضاوی نے ایک حدیث کا ذکر کیا ہے۔ لیس علی اھل الاسلام عشور (اہل اسلام پر عشر نہیں ہے) اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے نیز یہ بھی کہا ہے کہ اس سلسلے میں آنے والی بیشتر حدیث غیر صحیح ہیں۔

لیکن انھوں نے بقیہ احادیث اور ان کی صحت یا عدم صحت کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ بہت سی صحیح احادیث ہیں جو عشار اور ٹیکس وصول کرنے والوں کی تعذیب اور مکس کی مذمت کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ انھیں میں سے وہ حدیث بھی ہے جس کا ذکر قرضاوی نے بھی کیا ہے۔ امام مسلمؒ نے صحیح مسلم میں غامدیہ عورت کے قصے کے ضمن میں اس کا تذکرہ کیا ہے، جو زنا سے حاملہ ہو گئی اور ان کے اعتراف کے بعد نبیؐ نے ان پر حد نافذ کی۔ اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر صاحب مکس بھی ایسی توبہ کرے تو بخش دیا جائے۔"

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ صاحب مکس ان فاسقوں سے بھی زیادہ گنہگار ہے۔[۴۴]

اسی طرح اگر کسی حدیث کے راوی متعدد ہوں اور ان کی تعداد بھی کثیر ہو تو یہ چیزیں بھی حدیث کی تقویت میں معاون بنتی ہیں حتیٰ کہ اگر حدیث صحیح یا حسن کے درجہ تک پہنچے پھر بھی ایک دوسرے کو قوی ضرور کرتی ہے۔

طبرانی اپنی مسند سے عثمان بن ابی العاص سے روایت کرتے ہیں کہ نبیؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے قریب ہوتا ہے پھر جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے سوائے شرمگاہ کے ساتھ زنا کرنے والے اور عشار کے۔"[۴۵]

اس سلسلے میں آنے والی احادیث کے تجزیے سے ہم دو اہم نتیجے اخذ کرتے ہیں۔

پہلا یہ کہ عشور ایک معروف ٹیکس تھا جس کی بنا اسلام سے قبل ہی پڑی تھی اور اسی نام سے مشہور تھا۔ یہ سرحدوں اور چنگیوں سے گزرنے والے مال پر عشر کی حیثیت سے وصول کیا جاتا تھا۔ جب اسلام آیا تو اسے قولاً و فعلاً بالکل حرام کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کی ممانعت سے متعلق مذکورہ بالا احادیث بیان ہوئیں اور عملاً مسلمانوں کو اس سے سبکدوش کر دیا گیا، اور ان پر صرف زکوٰۃ فرض رہی۔ بخلاف خراج کے جس کے متعلق کوئی ممانعت نہیں آئی۔ اگر عشور جائز ٹیکس ہوتے تو نبیؐ نے اسے مسلمانوں کے لیے جائز قرار دیا ہوتا یا کم از کم خاموش رہتے اور ممانعت نہ فرماتے۔ ابو عبید کا خیال بھی یہی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں "جاہلیت کے رواجوں میں سے ایک عشور بھی تھا۔ نبیؐ نے اس کو باطل قرار دیا اور ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ فرض کی گئی ہر دو سو درہم میں پانچ درہم۔ چنانچہ جس نے زکوٰۃ عائد ہونے کے بعد اسے وصول کیا وہ عاشر نہیں۔ کیونکہ اس نے عشر نہیں بلکہ ربع عشر وصول کیا۔"[۴۶]

دوسرا یہ کہ مسلمانوں کے مال تجارت پر عشور کے جو احکام ہیں وہ اصلاً زکوٰۃ تجارت کے احکام ہیں، جن کے دلائل حسب ذیل ہیں:-

(الف) عشور تجارت کا تناسب بھی وہی ہے جو زکوٰۃ تجارت کا ہے یعنی ۲.۵٪ عشور کے تناسب کی تعیین حضرت عمرؓ کے اس قول سے ہوتی تھی: "مسلمانوں سے ہر چالیس

درہم میں ایک درہم وصول کیا جائے گا۔"

(ب) عشور کے لئے بھی نصاب وہی ہے جو زکوٰۃ کے لئے ہے اور جس طرح نصاب سے کم مال پر زکوٰۃ نہیں ہے، اسی طرح نصاب سے کم مال پر عشور سے بھی مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسف اسی سلسلہ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

"اگر کوئی شخص مال تجارت لے کر گزرے اور اس کا مال دو سو درہم یا بیس مثقال کے برابر ہو تو اس سے عشر لیا جائے گا۔ اور اگر اس کے مساوی نہ ہو اور اس کی قیمت دو سو درہم یا بیس مثقال سے کم ہو تو کچھ نہیں لیا جائے گا۔" [28]

(ج) عشور بھی سالانہ وصول کیا جائے گا جیسے زکوٰۃ تجارت، چنانچہ ابو یوسف فرماتے ہیں: [29]

"ایک ہی مال پر سال میں صرف ایک مرتبہ عشر وصول کیا جائیگا خواہ وہ دوران سال بار بار مال لے جائے۔" پھر فرماتے ہیں "اگر کوئی مسلم ایسا مال لے کر گزرے جس کی زکوٰۃ وصول نہیں ہوئی ہے تو اس سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ پھر اسی سال دوسرا مال لے کر گزرے جس کی زکوٰۃ نہیں ادا ہوئی ہے تو اس کی بھی زکوٰۃ وصول کی جائے گی کیونکہ ایک مال کی زکوٰۃ دوسرے مال کے لئے کافی نہیں ہوگی۔" [30]

(د) مسلمانوں سے وصول شدہ عشور زکوٰۃ کی فہرست میں رکھا جائیگا اور زکوٰۃ ہی کے مصارف پر خرچ ہوگا۔ اس سلسلے میں امام ابو یوسف کا بیان ہے [31]: "حضرت عمرؓ نے عشور نافذ کئے۔ اسے وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اس کے لئے لوگوں پر ظلم نہ کیا جائے۔ اور جتنا فرض ہے اس سے زیادہ نہ وصول کیا جائے۔ مسلمانوں سے جو عشور وصول ہو اس کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے۔ اور اہل ذمہ اور اہل حرب سے جو کچھ وصول ہو اس کا مصرف وہ ہے جو خراج کا ہے۔"

(ہ) مسلمانوں پر عشور کی مخالفت کے سلسلے میں جو احادیث آئی ہیں وہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے جو عشور وصول کئے وہ کوئی نیا ٹیکس نہیں تھا بلکہ وہ اصلاً زکوٰۃ ہی تھی۔ تعجب ہے کہ ڈاکٹر قرضاوی نے عاشر کی تشریح کرتے ہوئے یہ کیسے فرمایا کہ عاشر وہ ہے جو ناحق صدقہ وصول کرتا ہے اور اسکی دلیل یہ دی کہ

احادیث میں عاشر کی مذمت آئی ہے حالانکہ یہ ایک اور دلیل ہے اس بات کی کہ مسلمانوں سے جو عشور ہیں وہ اصلاً زکوٰۃ تجارت ہے اور اس کا نام عشور محض اس مناسبت سے رکھ دیا گیا کہ یہ بھی اہل حرب اور ذمیوں سے عشور کی وصولی کے وقت لیا جاتا ہے۔ جن حدیث میں عاشر کی مذمت آئی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ تجارت کی قسم یا ربع عشر سے زیادہ وصول کرنا حرام ہے جسے لینے کا کوئی جواز نہیں۔ [32]

(و) اس کی ایک اور دلیل ماوردی کا یہ بیان ہے کہ اسلامی ممالک کے اندر تجارت پر کوئی عشر نہیں ہے۔ فرماتے ہیں "دار الاسلام کے اندر شہروں کے درمیان مختلف قسم کے سامان تجارت پر عشر حرام ہے۔ نہ اس کو کوئی شرع جائز قرار دیتی ہے اور نہ اجتہاد اس کو مناسب سمجھتا ہے۔ اور نہ یہ عدل و انصاف کا تقاضہ ہے۔" [33]

(ز) زیاد بن حدیر سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ نے مجھے نصاریٰ بنی تغلب میں بھیجا اور ان سے نصف عشر وصول کرنے کا حکم دیا لیکن کسی مسلم یا خراج ادا کرنے والے ذمی سے عشر وصول کرنے سے منع کر دیا۔ یحییٰ کہتے ہیں کہ یہاں (ان لا تعشر مسلماً ولا ذمة یؤدی الخراج) لفظ "مسلم" سے مراد بنی تغلب کے وہ لوگ ہیں جو ایمان لا چکے تھے کیونکہ بنی تغلب ایک عیسائی قبیلہ تھا اور اس کے بیشتر لوگ نصرانی تھے [34]۔ گویا یہاں لفظ عشر جزیہ کی جگہ پر استعمال ہوا ہے جو غیر مسلموں سے وصول کیا جاتا ہے، اور مسلمان اس سے بری ہیں۔

(ح) ابو عبید کہتے ہیں: "اگر عشر وصول کرنے والے کو مسلمان کے دعوے پر شبہہ ہو اور اس کو حلف دلانا چاہے تو سفیان کے نزدیک مسلم کو حلف نہیں دلایا جائے گا کیونکہ زکوٰۃ کے سلسلے میں مسلم قابل اعتماد ہیں اور بغیر حلف کے ان کی حلف قابل قبول ہے۔ امام مالک کے نزدیک بھی مسلم کی بات قابل تسلیم ہے۔ اس سلسلے میں ایک صاحب اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ میں عبد اللہ بن معقل کے پاس سے گزرا، وہ عشر کی وصولی میں لوگوں کو حلف دلا رہے تھے۔ میں نے کہا اے ابن معقل! کیوں لوگوں کو حلف دلاتے ہو۔ خود ہلاک ہوتے ہو اور انہیں بھی ہلاکت میں ڈال رہے ہو؟" کہنے لگے، "مگر ایسا نہ کرو"

تو لوگ کچھ بھی ادا نہ کرتے"۔ میں نے کہا، "تمہارا کیا بگڑتا ہے جو دیتے ہیں لے لو"[۳۳]

لیکن امام ابو یوسفؒ مسلمان کو بھی حلف دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں، اگر تاجر عشر وصول کرنے والے کے پاس سے مال تجارت لے کر گزرے اور کہے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کی جا چکی ہے اور قسم کھائے تو اس کی بات قابل قبول ہوگی اور عشر نہیں وصول کیا جائے گا۔ لیکن اس معاملے میں حربی اور ذمی کی قسم قابل قبول نہیں ہوگی کیونکہ ان دونوں کے لئے عشر کی حیثیت زکوٰۃ کی نہیں ہے (اور قسم صرف زکوٰۃ میں قابل قبول ہے بصورت دیگر گواہ کا ہونا ضروری ہے۔)[۳۴]

اس طرح مسلم فقہاء کے نزدیک عشور تجارت کے متعلق یہ بات بالکل مسلم ہے یہ زکوٰۃ تجارت ہی ہے۔ اسی وجہ سے جب ایک مرتبہ اس کی ادائیگی کر دی جاتی ہے تو پھر دوبارہ ادائیگی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ خواہ تاجر عاشر کے پاس سے سال میں کئی مرتبہ گزرے، اس پر صرف ادائیگی کا ثبوت فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے خواہ قسم کے ذریعہ یا اور کسی ذریعہ سے۔

جس حدیث میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں سے عشر نہیں لیا وہ بھی ثابت کرتی ہے کہ حضرت عمرؓ مسلمانوں پر کوئی نیا ٹیکس نہیں لاگو کرنا چاہتے تھے بلکہ آپ جو کچھ بھی لیا وہ زکوٰۃ ہی تھی۔ البتہ اس کو اہل حرب کے عشر اور اہل ذمہ کے نصف عشر کے ساتھ یکجا کر دیا گیا۔ وہ بھی محض اس مناسبت سے کہ اسے بھی تاجروں سے ملک میں ان داخل ہوتے وقت ہی وصول کیا جاتا تھا۔ اس اشتراک کے باوجود بھی زکوٰۃ اپنی فطرت، احکام اور مصارف کے اعتبار سے ان دونوں سے مختلف ہے۔

اس کی تائید ابو عبید کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ "عشور کے نفاذ میں حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ اور اہل حرب سے پورا عشر وصول کرتے تھے کیونکہ وہ بھی ان کے ملک میں جانے والے مسلمان تاجروں سے عشور وصول کرتے تھے"

ابو عبید کہتے ہیں کہ اہل ذمہ سے عشور وصول کرنے کا سبب میری سمجھ میں نہ آتا تھا چنانچہ میں سوچتا تھا کہ یہ نہ تو مسلم ہیں کہ ان سے زکوٰۃ تجارت وصول کی جائے

اور نہ ہی اہل حرب ہیں کہ ان سے صدقۃ بالمثل[لہ] وصول کیا جائے۔ پھر کافی غور و خوض کے بعد یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ جزیہ اور زمینی خراج کے علاوہ عشور پر بھی ان کے ساتھ صلح ہوئی تھی۔[۳۵]

ابو عبید کے اس تجزیے سے بھی ہمارا اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے عشور اصلاً زکوٰۃ تجارت اور اہل حرب کے عشور صدقۃ بالمثل ہیں۔ اہل ذمہ کے عشور کی حیثیت ... کی تعیین میں ابو عبید کو مشکل پیش آئی پھر انہیں سمجھ میں آیا کہ حضرت عمرؓ نے ان خاص سے صلح کی تھی۔

ابو عبید ایک جگہ امام مالک اور اہل حجاز کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اہل ذمہ سے جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ زکوٰۃ نہیں ہے کہ اس کے لئے نصاب دیکھا جائے بلکہ یہ تو جزیہ کی مانند ہے جو امیر و غریب ہر ایک سے بقدر استطاعت وصول کیا جاتا ہے اور مال پر پورا سال گزرنے کی بھی شرط نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ اہل حجاز ہر گزرنے والے مال پر خواہ کم ہو یا زیادہ عشور وصول کرنے کے قائل ہیں۔[۳۶]

گذشتہ تفصیلات سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دارالاسلام یا اسلامی ممالک کے اندر کوئی custom duty یا ٹیکس (عشر) نہیں ہے بلکہ ان کے لئے یہ مطلقاً حرام ہے۔ البتہ عشور کے نام پر جو کچھ وصول کیا جاتا ہے وہ اصلاً زکوٰۃ تجارت ہے۔ اہل ذمہ کے لئے یہ صلح کے لئے ذریعہ نافذ شدہ ٹیکس اور اہل حرب کے لئے صدقۃ بالمثل ہے۔ اسطرح مسلمانوں کیلئے عشور کے احکام، نصاب اور مقدار کے متعلق وہی احکام ہونگے جو معروف زکوٰۃ تجارت کے ہیں۔ اہل ذمہ کیلئے یہ ٹیکس ہے جسکے احکام حضرت عمرؓ نے پوری شرط و قیود کیساتھ متعین فرما دیئے ہیں۔ اس کو آج کی اصطلاح میں Custom tariffs سمجھا جا سکتا ہے۔ اہل حرب کیلئے چونکہ یہ صدقۃ بالمثل یا بالمثل ٹیکس ہے اسلئے اسکے احکام وہ ہونگے جو مسلمان تاجروں پر اپنے ملک میں لاگو کرتے ہیں۔

لہ صدقۃ بالمثل کا مفہوم یہ ہے کہ جسطرح اہل دارالحرب مسلم تاجروں پر اپنے ملک میں ٹیکس عائد کرتے تھے اسی طرح اسلامی حکومت بھی انکے بدلے میں اپنے ملک میں آنیوالے دارالحرب کے تاجروں پر ٹیکس عائد کرتی تھی۔

حواشی

(۱) ڈاکٹر صبحی الصالح "النظم الاسلامیۃ" دار العلم للملایین - بیروت ص ۳۵۴

(۲) ابو یوسف "الخراج" المطبعۃ السلفیۃ - ط/۳ ۱۳۹۲ھ ص ۱۳۵، ۱۳۶

(۳) ڈاکٹر ابراہیم فواد "الموارد المالیۃ فی الاسلام" مکتبۃ الانجلو المصریۃ ۱۹۷۲ء ص ۲۰۶

(۴) جرجی زیدان "تاریخ التمدن الاسلامی" مطبعۃ الہلال، ج ۱/ ص ۱۳۵

(۵) عبدالسمیع مصری - مقومات الاقتصاد الاسلامی" مکتبۃ وہبۃ ۱۹۷۵ء ص ۱۶۰

(۶) نیز ڈاکٹر یوسف القرضاوی فقہ الزکوٰۃ ج ۲/ ص ۱۰۹۸، ۱۱۰۵

(۷) رواہ الامام احمد، ابوداؤد و صححہ علی شرط مسلم - دیکھئے ابوعبید "الاموال" ص ۶۳۲

(۸) یحییٰ بن القطان بن لہیعۃ نے بھی یہ حدیث اسی سند اور متن کے ساتھ روایت کی ہے
ابن الاثیر "النہایۃ" - دیکھئے ابوعبید "الاموال" مکتبۃ الکلیات الازہریۃ ج ۲/ ۱۹۷۶ء ص ۶۳۴

(۸) ابن الاثیر غریب الحدیث والاثر - دار احیاء الکتب العربیۃ - الحلبی ج ۲ ص ۱۱۰

(۹) الذہبی "الکبائر" مطبعۃ البیان - بیروت ص ۱۱۹

(۱۰) الحافظ المنذری - الترغیب والترہیب - طبع مصطفیٰ البابی الحلبی ص ۵۶۷

(۱۱) بالامام المناوی "فیض القدیر شرح الجامع الصغیر" ج ۶ ص ۴۹۴ - المکتب الاسلامی بیروت

(۱۲) ابوعبید مرجع سابق ص ۲۳۵ (۱۳) مرجع سابق ص ۶۳۶

(۱۴) الہیثمی "مجمع الزوائد و منبع الفوائد" مکتبۃ القدس ج ۳ ص ۸۷

(۱۵) المناوی "التیسیر شرح الجامع الصغیر" المکتب الاسلامی بیروت ج ۱ ص ۳۵۸

(۱۶)(۱۷) ابوعبید ص ۶۳۷ - ۶۳۸ (۱۸) دیکھئے حسب ذیل مراجع
ڈاکٹر عبدالخالق النواوی - النظام المالی فی الاسلام - المکتبۃ العصریۃ ۱۹۷۱ء ص ۱۳۰
ڈاکٹر حسن غلاب "المحاسبۃ الضریبیۃ مبادؤہا و اصولہا العلمیۃ" مکتبۃ التجارۃ والتعاون ۱۹۷۶ء ص ۳۸ - ۴۰

(بقیہ صفحہ ۶۴ پر)

غزل

قمر رسولپوری

وہ میرے نام سے بیزار بھی ہے
میرے نغموں سے اسکو پیار بھی ہے

وفورِ غم میں اشکوں کا چھلکنا
یہ ضبطِ غم بھی ہے اظہار بھی ہے

عدو سے لے کے بدلہ سوچتا ہوں
یہ میری جیت بھی ہے ہار بھی ہے

گلے ملئے مگر اتنا سمجھ کر
محبت صلح بھی پیکار بھی ہے

یقیناً وہ مرا بھائی ہے پھر بھی
ہمارے درمیاں دیوار بھی ہے

وہ گر جائیں گے دنیا کی نظر سے
جنھیں دنیا سے اتنا پیار بھی ہے

کسی دن جیت لے جائے گا بازی
وہ انساں صاحبِ کردار بھی ہے

قمر جس کے بہت نزدیک ہوں میں
بڑا شاطر بھی ہے فنکار بھی ہے

* عبدالبر اثری فلاحی

تعارف و تبصرہ

نام کتاب: اسلام، عورت اور عصر حاضر
مؤلفہ: ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری ایم اے پی ایچ ڈی
ضخامت: ۲۰۸ صفحات
قیمت: ۲۵ روپے
ناشر: ویژن دانش پبلکیشنز، عظیم آباد کالونی پٹنہ ۸۰۰۰۰۶

مجھے پہلی مرتبہ موصوفہ کی تحریر پڑھنے کا اتفاق ہوا اگرچہ کتاب پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی ان کی دو قابل قدر کتابیں "تجلیات حرم" اور "الہام ربی" کے نام سے منظر عام پر آچکی ہیں اور خود یہ کتاب مختلف اوقات میں مختلف عناوین پر لکھے گئے ۲۲ ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف دینی اور اصلاحی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن اس پہلی ہی ملاقات میں ان کی تحریر نے ان کی بعض تحریروں کی روشنی میں دیگر تحریروں کو پڑھنے کے لیے ایک عجیب کشش دل و دماغ میں پیدا کر دی ہے۔

وہ موضوعات جن پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے عام طور سے علمی، حالات کا مطالعہ اور تجزیاتی ہیں۔ مغربی تہذیب کی باطل اقدار کا جو ایک سیل رواں امڈ پڑا ہے اور جس دلکش اس سے مرعوب نظر آتا ہے اور چہرے سے چہرے ای کو پایا جا رہا ہے جو اسی میں اپنی عافیت اور سعادت سمجھتا ہے اس کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عقلی، مثبت اور دو ٹوک جواب دینے کی اس کتاب کے اندر بہترین کوشش کی گئی ہے اور اس تقابل میں بہت سے نئے اور مفید

گوشے سامنے آئے ہیں اس سلسلے میں عورتوں سے متعلق مضامین خصوصی اہمیت کے حامل ہیں بطور خاص "تحریک نسواں اسلامی اور مطالبات"۔

اس سلسلے میں دوسری قابل قدر چیز یہ ہے کہ موصوفہ نے جو کچھ لکھا ہے انتہائی خلوص و للہیت کے ساتھ لکھا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے حالات کا غم انھیں کھائے جا رہا ہے اور ایک کڑھن ہے جس میں وہ گھلی جا رہی ہیں اور اسی نے ان کے اندر درد و سوز و گداز پیدا کر دیا ہے کہ عام طور سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ جذبات کی رو میں بہی جا رہی ہیں۔ واقف عظیم آبادی نے سچ کہا ہے

ع اس کا ہر پیرایۂ مضمون ہے دل سوزی کے ساتھ
روشنی منبع ہے ایمان افروزی کے ساتھ،

اس کتاب کے اندر ایک تیسری قابل قدر چیز یہ ہے کہ اس میں براہ راست قرآن و سنت سے استفادہ کی جھلک نمایاں ہے، مسلکی اختلافات و تعصبات سے نہایت خوش اسلوبی سے بچایا گیا ہے اور کھلے ذہن کے ساتھ تمام ہی موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے جیسا کہ ان کی تردید کسی پر چوٹ ہو یا اس سے کسی کی تائید مقصود ہو۔

ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ چند پہلو ایسے بھی ہیں جن کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اگر آئندہ ان کا خیال رکھا گیا تو خود کتاب کا حسن دوبالا ہو جائے گا اور موصوفہ کی تحریری زندگی کے لیے بھی کارآمد ثابت ہوگا۔

سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ آیات، احادیث، منقولہ عبارتوں کے حوالے مکمل ہونے چاہئیں جبکہ اس کا ہر جگہ لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، جو بہرحال کتاب کے معیار کو متاثر کرتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ عام عبارتوں سے قرآن و حدیث کے حوالوں کو ممیز کرنے کے لیے الگ طرز کتابت اپنایا گیا ہے لیکن ہر جگہ اسے برتا نہیں گیا ہے جس سے بہرحال کتاب کا حسن و وقار مجروح ہوتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ایک زبان سے دوسری زبان میں کسی چیز کا ترجمہ کرنا بڑا نازک

کام ہے اور اس سلسلے میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ معنی و مطلب کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے اس کی طرف بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ص ... پر ایک حدیث ماں کے احترام کی فضیلت میں نقل کی گئی ہے "فَاِنَّ الْجَنَّةَ عِنْدَ رِجْلَيْهَا" (مسند احمد) اور اس کا ترجمہ کیا ہے "تمہاری جنت اس کی قدموں میں ہے" جو بہرحال ان الفاظ کا پورے طور پر ساتھ نہیں دے رہا ہے۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ تحریر جو کہ تحریر دستہ سمجھی جاتی ہے جس میں رائج الوقت اور موزوں الفاظ استعمال کئے جائیں ورنہ وہ معیاری چیز نہیں سمجھی جاتی ہے اس کی رعایت بھی ضروری ہے مثلاً ص ... پر ایک لفظ استعمال کیا گیا ہے "بیمار پرسی" حالانکہ اس کی جگہ بہتر استعمال "مزاج پرسی" ہے۔ ان سب سے ہٹ کر ایک اہم اور آخری چیز یہ ہے کہ آیات و احادیث کے استعمال اور ان سے استدلال کے سلسلے میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے کئی چیزیں اس سلسلے میں کھٹکیں میں بطور مثال دو چیزوں کا ذکر کرتا ہوں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ آپ نے صفحہ ۲۳ پر لکھا ہے "اس سے قطعی انکار نہیں کہ مفید دنیاوی تعلیم نہایت ضروری ہے ورنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں نہ فرماتے کہ علم کے حصول کے لئے چین بھی جانا پڑے تو جاؤ۔ کیا اس زمانہ میں چین جیسے دور دراز ملک میں جب کہ اسلامی تعلیمات وہاں تک نہیں پہونچی تھیں کوئی دینی تعلیم حاصل ہوتی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد دنیاوی تعلیم کے حصول سے بھی تھا تاکہ انسان اللہ کی تخلیق کی ہوئی اس بے کنار کائنات کے اسرار و رموز سے واقف ہو اللہ کی وحدانیت کا قائل ہو اور عقل و فہم استعمال کر کے قانون قدرت پر کاربند رہے۔"

دنیاوی تعلیم کے اہم اور ضروری ہونے سے انکار نہیں لیکن ایک موضوع روایت سے اس کا اثبات بہرحال محل نظر ہے جب کہ اس موضوع روایت کو اگر صحیح مان بھی لیا جائے تو ظاہر روایت سے دنیاوی تعلیم کی اہمیت بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ مطلق علم بلکہ علم دین کے حصول پر ابھارنا مقصود ہے جب کہ آپ کے استدلال سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضور کی منشا دنیاوی تعلیم کے حصول پر آمادہ کرنا تھا۔

اس روایت کے بارے میں آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ متفقہ طور پر باطل ہے اس روایت پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے عصر حاضر کے مشہور عالم حدیث علامہ ناصر الدین البانی اپنی مشہور کتاب "سلسلة الاحاديث الضعيفة" جلد اول صفحہ ۴۱۳ پر لکھتے ہیں جو واضح رہے کہ خاص اور اہم باتیں میں اپنے الفاظ میں لکھ رہا ہوں۔

یہ حدیث باطل ہے اور اس سلسلہ رواۃ میں ابو عاتکہ نامی ایک شخص ہے جسے عقیلی نے حد درجہ ضعیف قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے "منکر الحدیث" کہا ہے۔ امام نسائی نے "غیر ثقہ" کہا ہے اور ابو حاتم نے "ذاهب الحديث" قرار دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

پھر اس روایت کو جتنے علماء نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے ان کا حوالہ دینے کے بعد ان سب کا تعاقب کرتے ہوئے بھی اس کا بطلان ثابت کیا ہے اور دکھایا ہے کہ امام احمد نے اس حدیث کا انکار کیا ابن الجوزی نے بھی اپنے یہاں "الموضوعات" میں جگہ دی ہے۔ ابن حبان نے "باطل لا اصل له" کہا ہے پھر اس کے بعد آخر میں یہ دکھایا ہے کہ اصلاً اس حدیث کو سب سے پہلے شام کے شہر ... میں سے کسی نے گڑھا اور ... "تعالیم الاسلام" نامی کتاب میں جگہ دی جو اس طرح کی موضوع روایتوں سے پر ہے۔ ایسا نہیں کہ اس پر صرف علامہ البانی نے گفتگو کی ہے بلکہ مولانا مودودیؒ، مولانا ابو الکلام آزاد وغیرہ نے بھی گفتگو کی ہے۔

غرض بہرحال اگر روایت کو صحیح مان بھی لیا جائے تو اس کے اسلوب وغیرہ سے جو مفہوم نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ علم کے حصول کی خاطر دور دراز کا سفر بھی کرنا پڑے تو علم کی اہمیت کے پیش نظر اسے برداشت کرنا چاہئے یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ لفظ "العلم" آیا ہے جو بہرحال اپنے عمومی استعمال کے اعتبار سے علم دین ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دوسری چیز یہ کہ شب برات پر جو مضمون آپ نے تحریر کیا ہے اس کے مندرجات میں بہت ساری چیزیں محل نظر ہیں جس کا یہاں موقع نہیں صرف ابتدائی حصہ لیتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے

• قرآن مجید میں ماہ شعبان کی پندرہویں شب کو "لیلۃ مبارکۃ" کے

نام سے موسوم کیا گیا ہے اور بعض مفسرین کے خیال میں اس سے متعلق سورۂ دخان میں ہے کہ
(اجمالی آیات کا ترجمہ لکھا ہے پھر لکھا ہے)

> ان آیات میں رب ذوالجلال والاکرام نے جس برکت والی رات کا ذکر کیا ہے اس کے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ ماہِ شعبان کی پندرھویں تاریخ ہے اور اکثر اکابرین اس سے شب قدر مراد لیتے ہیں کیونکہ قرآن مجید کہتا ہے کہ قرآن شب قدر میں نازل ہوا اس بنا پر عقل اس کو تسلیم کرتی ہے کہ قرآن مجید کے نزول کی تیاریوں کا آغاز اسی لیلۃ المبارکۃ سے ہو چکا تھا
>
> صفحہ ۱۱۲

اس سلسلے میں عرض یہ کرنا ہے کہ لیلۃ المبارکۃ سے شعبان کی پندرھویں شب مراد ہے یہ صرف چند کا خیال ہے جیسا کہ آپ نے اشارہ کیا ہے جن میں نام نہ صرف عکرمہ کا آتا ہے باقی لوگ مجہول ہیں، دوسری طرف اکثر اکابر علماء وقت ہیں اس میں آپ نے تطبیق کی جو کوشش کی ہے وہ سمجھ میں نہیں آتی اولاً تو اس وجہ سے کہ نزول کی تیاری وغیرہ کا مسئلہ غیب سے تعلق رکھتا ہے جس کے سلسلے میں معروف ذرائع سے کچھ جانے بغیر ہمیں کلام نہیں کرنا چاہئے دوسرے یہ کہ خود آیت اور سیاق و سباق کا جو مفہوم اور تقاضا ہے وہ اس تاویل کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ اکابر علماء کی تاویل کے حق میں ہے (تفصیل کیلئے ملاحظہ فرمائیں امام رازی کی تفسیر کبیر)

لہٰذا جماعت کے لئے بھی بہتر یہ ہے کہ ہم اقرب الی الصواب کو قبول کریں اور اس کی بنیاد پر کوئی گفتگو کریں، یہ تھے میری طرف سے چند قابل لحاظ پہلو اگر سمجھ میں آئے تو امید کہ ملحوظ رکھیں گے ویسے بحیثیت مجموعی کتاب قابل مطالعہ ہے اور ہر پڑھنے والا پڑھنے کے بعد یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے کہ اسے کچھ ملا ہے۔

اخیر میں اپنے آپ کو پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کے اس احساس میں برابر کا شریک کرتا ہوں کہ ان میں اخلاص ہے، بیباکی اور دل سوزی کے ساتھ یہ مضامین سپرد قلم کئے گئے

اور چاہے کسی کا خوش حال طبقے سے تعلق ہو یا مفلوک الحال طبقے سے سب بھی اپنے آپ کو اسلام کا نوکر سمجھیں، جب ہی کایا پلٹ ہو سکتی ہے اور مسئولیت سے بچاؤ ہو سکتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند اور دوسرے اداروں کے نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں مکمل طور سے تبدیلی لانے کی ضرورت ہے جب ہی خاطر خواہ نتائج سامنے آسکتے ہیں اور ان کا سربراہ ایسے لوگوں کو بنایا جائے جنہیں قرآن کا انسان کے لئے ٹھہرایا ہوا نصب العین عزیز ہو اور اس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، ایسے لوگوں کو قطعاً ان کا ذمہ دار نہ بنایا جائے جو اس سے بے سبیل ہوں ورنہ یہ تبدیلی نتیجہ بخش نہ ہوگی اور نہ اس سے وہ ثمرات حاصل ہوں گے جو مطلوب اور عزیز ہیں لیکن کسی ادارے کے معراج کمال تک پہنچنے کے لئے نہ معلوم کیوں یہ ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ اسلام دشمن عناصر کی خدمات اسے حاصل ہوں جب ہی اس ادارہ کو چار چاند لگیں گے، مسلم یونیورسٹی میں تشکیک، مذہبی آزادی، اسلامی اقدار کا تمسخر اور اسی طرح کے دوسرے جراثیم اسی طرح کے عناصر کی آمد اور یونیورسٹی سے وابستگی کے طفیل میں پیدا ہوئے اور پھر وہ ہوا جو اس کے بانیوں کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ ایسا ہوگا۔ خرابیوں کے مداوی کے لئے بڑی آن بان سے جامعہ وجود میں آیا لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے وہ ان مقاصد میں علی گڑھ سے بھی بازی لے گیا۔ ع

اب کسے رہنما کرے کوئی

بقیہ: دینی درسگاہوں کے "نظام تعلیم"

لے گئے ہیں، اچھے کلاس چند بخیر و خوش سگالی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا جائے گا تاکہ اس کے پس پشت فکر و نظر کی جو وسعت اور تابندگی اور ایمان و ایقان کی جو حرارت و توانائی ہے اس کا احساس عام ہو اور اس کی کشش اور بخشش تشہیر ہو صفحہ ۲۱

★ محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

جامعہ میں تعطیل کا آغاز ہو چکا ہے اور وہ گلزار جو اب سونی سونی ہو گئی ہے، طلبہ و اساتذہ جن سے اس کی زندگی، رونق اور چہل پہل ہے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے ہیں۔ ان شاء اللہ جامعہ کا اگلا تعلیمی سفر ۵ر جون سنہ صبح ۸ بجے سے شروع ہوگا۔

ولی اللہ سعیدی جامعہ سے سبکدوش

برادر ولی اللہ سعیدی فلاحی سابق مرتب حیات نو ایک عرصہ سے صحت کی خرابی سے دوچار ہیں۔ اسی وجہ سے موصوف حیات نو کی ترتیب وغیرہ سے بھی معذور ہے اور اب اسی بنا پر ذمہ داران جامعہ نے ان کے لیے مستقل آرام و علاج تجویز کیا ہے۔ چنانچہ موصوف اب اپنے گھر بستی منتقل ہو گئے ہیں۔ انھوں نے خرابی صحت کے باوجود حیات نو کو سنبھالا دیا، ادارہ ان کا مشکور ہے اور ان کے لئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔ برادر کے اعزاز میں انجمن کی طرف سے ایک عصرانے کا اہتمام کیا گیا جس میں حاضرین نے طویل رفاقت کے بعد اس جدائی پر اپنے غم کا اظہار کیا اور انھیں نیک مشورے دیئے۔

مولوی محمد ادریس صاحب علیل

مولوی محمد ادریس صاحب جامعہ کے بہت ہی قدیم اور بزرگ استاذ ہیں۔ جامعہ سے متصل موضع بنگائی پور کے رہنے والے ہیں۔ چند سال قبل جامعہ کی طرف سے سنگی پور کے دورے پر موصوف تشریف لے گئے تھے وہاں گرنے کی وجہ سے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی اور کمر میں بھی کافی چوٹ آئی جس کی وجہ سے دوا کھاتے رہتے تھے ابھی

...ماہ قبل دوبارہ گرنے کی تکلیف شروع ہو گئی اور اب تقریباً معذور ہو گیا ہے۔ قارئین سے موصوف کے لئے دعائے صحت کی درخواست ہے۔

استقبالیہ

جامعہ اور اہل جامعہ جب نئے فارغین کو رخصت کرتے ہوتے ہیں، انجمن آگے بڑھ کر ان کا استقبال کرتی ہے۔ اس دفعہ ۱۲ر مارچ سنہ کو انجمن نے اسی استقبالیہ کا اہتمام کیا۔ اس سال فارغ ہونے والوں کے نام یہ ہیں۔ محمد اقرار (گونڈہ)، خالد حسن رشید (کلکتہ)، ضیاء الرحمان (بلرام گنج)، محمد عثمان (بستی)، ریاض الدین (گونڈہ)، عبدالشکور (بستی)، محمد عرفان (بجنور)، احسان اللہ فہد (گونڈہ)، ذوالفقار علی (نیپال)، عزیز الرحمان (سنبھل)، عبدالرحمان (گونڈہ)، محمد فیاض (مالیگاؤں)، عبدالاحد (بستی)، عابد حسین (مظفر نگر)، غلام سرور (گیا)، عبدالحمید (بستی)

اس پروگرام میں مولانا احسان الحق صاحب فلاحی، مولانا انور محمد صاحب فلاحی، مولانا رحمت اللہ اثری صاحب فلاحی اور مولانا محمد عمران صاحب فلاحی نے انجمن کے اغراض و مقاصد* کو بروئے عمل لانے کے لئے قائم ہوئی ہے اور جامعہ کے اغراض و مقاصد دراصل اسلام ہی کے اغراض و مقاصد ہیں۔ انجمن یہ توقع رکھتی ہے کہ جس مقصد کے لئے جامعہ قائم ہوئی ہے اسی مقصد سے اس کے فارغین کی دلچسپی اور وابستگی باقی رہے گی وہ اس سے بہک نہ جائیں اور بھٹک نہ جائیں انجمن نے کہا ہم ہر منزل اور ہر گام پر آپ کے ساتھ ہیں، ہم اپنے مسائل مل جل کر حل کریں گے۔

اس اجلاس نے امسال فارغ ہونے والے طلباء کی یہ بات بھی نوٹ کی کہ گزشتہ دنوں جامعہ جن نازک حالات سے گذری، اس میں انھوں نے کس طرح اپنی ذمہ داری ادا کی، ہر عصبیت و مصلحت سے اوپر اٹھ کر اتحاد و یگانگت اور جامعہ سے خیر خواہی کا مظاہرہ کیا۔ جامعہ ان کے اس کارنامہ کو فراموش نہیں کر سکتی، اور * اس کی تاریخ لکھنے والا اسے آب زر سے لکھے گا۔

* [illegible] جامعہ کے مقاصد

محمد محفوظ فلاحی صاحب کو صدمہ

جناب محمد محفوظ فلاحی صاحب بھوپالی کے بڑے بھائی جناب مولانا حافظ منصور نعمانی ندوی صاحب ۱۹ر فروری، بروز جمعہ نماز کی حالت میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ عرصہ تک مرحوم دار المصنفین اعظم گڈھ سے بحیثیت رفیق منسلک رہے ہیں۔ مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم سے موصوف کو خاص تعلق تھا اور جامعۃ الفلاح و اساتذۂ جامعہ سے بھی گہری ہمدردی تھی۔ مرحوم جماعت اسلامی کے ہمدردوں میں تھے۔ ادارہ حیات نو پسماندگان سے اظہار تعزیت کرتا ہے اور مرحوم کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

بقیہ صفحہ: اسلامی عشور اور جدید محاصل۔

حسن الفرزدی: "مبادی الاصول العلیۃ للخراج" مطبعۃ الحلبی ۱۹۴۳ء ص ۴۷-۴۸۔ عبد السمیع المصری۔ مرجع سابق ص ۱۶۰،

(۱۹) ڈاکٹر یوسف القرضاوی۔ مرجع سابق ج ۲/ ص ۹۶۸-۹۸۲

(۲۰) ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی آراء پر تفصیلی گفتگو اس لئے کی گئی ہے کہ صرف انکی کتاب میں اس موضوع پر مدلل اور مفصل بحث کی گئی ہے۔ دوسری کتابوں میں عشور کو custom duties کے مماثل سمجھ لیا گیا ہے اور بغیر کسی سند کے یا تحقیق کے اسکی شرعیت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔

(۲۱) ڈاکٹر یوسف القرضاوی ج ۲/ ص ۱۰۹۳، (۲۲) الھیثمی مرجع سابق ص ۸۸-۸۹

(۲۳) " " " مرجع سابق ج ۲/ ص ۹۵۰، (۲۴) ایضاً ص ۱۰۹۰

(۲۵) الحافظ نور الدین الھیثمی " ص ۱۰۹۰، (۲۶) ابو عبید ص ۶۳۹

(۲۷) ابو یوسف ص ۱۳۳؛ (۲۸) ابو عبید ص ۶۴۷

(۲۹) ابو یوسف ص ۱۳۵؛ (۳۰) ڈاکٹر یوسف القرضاوی ج ۲/ ص ۱۰۹۳

(۳۱) الماوردی: "الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ" المکتبۃ التوفیقیۃ [illegible] ص ۲۳۶

(۳۲) یحییٰ بن آدم: "الخراج" المطبعۃ السلفیۃ۔ ط ۲/ ۱۳۸۴ھ ص ۶۱-۶۲

(۳۳) ابو عبید ص ۶۳۸-۶۳۹ (۳۴) ابو یوسف ص ۳۴؛

(۳۵) ابو عبید ص ۶۳۸۔ (۳۶) ابو عبید ص ۶۴۳

اعلانِ داخلہ

مدرسہ مصباح العلوم جوکونیاں پوسٹ بھاٹ بھاری بستی یوپی

ملحق

جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڈھ یوپی

مدرسہ مصباح العلوم جوکونیاں ایک تعلیمی و تربیتی درسگاہ ہے جو دینی و عصری علوم پر مشتمل نصاب تعلیم کے تحت رواں دواں ہے جس میں تیرہ مخلص و محنتی اساتذہ نیز چار درجن کارکنان دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ بہت خوش آئند بات ہے کہ یہ مدرسہ جامعۃ الفلاح بلریا گنج سے ملحق ہے۔ یہاں ممتحن جامعہ سے آتے ہیں۔ ممتحن پورا امتحان اپنے زیر نگرانی انجام دلاتے ہیں کاپیاں جامعہ کے اساتذہ جانچتے ہیں۔ صدر جامعہ خود یا اپنا نمائندہ بھیج کر ہر سال تعلیمی تربیتی و انتظامی معائنہ کرتے اور ہر شعبہ کے متعلق مفید مشورے دیتے ہیں تاکہ یہ نوخیز ادارہ ترقی کے صحیح رخ پر گامزن ہو سکے۔ اب تک ہاسٹل میں ساٹھ طلباء مقیم رہے جن کے خورد و نوش کا معقول نظم ہے۔ مستطیع طلباء سے ماہانہ فیس خوراک کی حسب مصارف لی جاتی ہے۔ البتہ نادار و غیر مستطیع طلباء کو مدرسہ چند اخلاقی و تعلیمی شرائط کے ساتھ وظائف دیتا ہے۔ طلباء کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے اتالیق حضرات بچوں کو اسلامی اخلاق و آداب اور دینی سیرت و کردار کا حامل بناتے ہیں تاکہ یہ مدرسہ ایک قابل اعتماد تربیت گاہ و درسگاہ بن سکے۔ اس طرح مدرسہ نے قلیل مدت میں اپنی معیاری تعلیم و بہتر تربیت کی بنا پر نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ لہذا آپ حضرات اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کے لئے مدرسہ کی خدمات حاصل کریں۔ اس سال عربی درجات میں وظیفے کی زیادہ گنجائش ہے۔

درخواست ۲۵ رمضان تک آجانی چاہئے۔ مزید معلومات کے لئے قواعد و ضوابط اور داخلہ فارم ایک روپیہ کا ٹکٹ بھیج کر طلب فرمائیں۔ داخلہ ۸ر شوال سے ۱۵ر شوال تک ہوگا۔ اخلاقی، تصدیق نامہ نتیجہ کارڈ ساتھ لائیں۔ داخلہ ٹسٹ کی بنیاد پر ہوگا۔

پتہ: صدر مدرسہ، مدرسہ مصباح العلوم جوکونیاں پوسٹ بھاری ضلع بستی یوپی
ملحق جامعۃ الفلاح بلریا گنج، اعظم گڈھ (یوپی)